"قوموں کی اصلاح نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی"
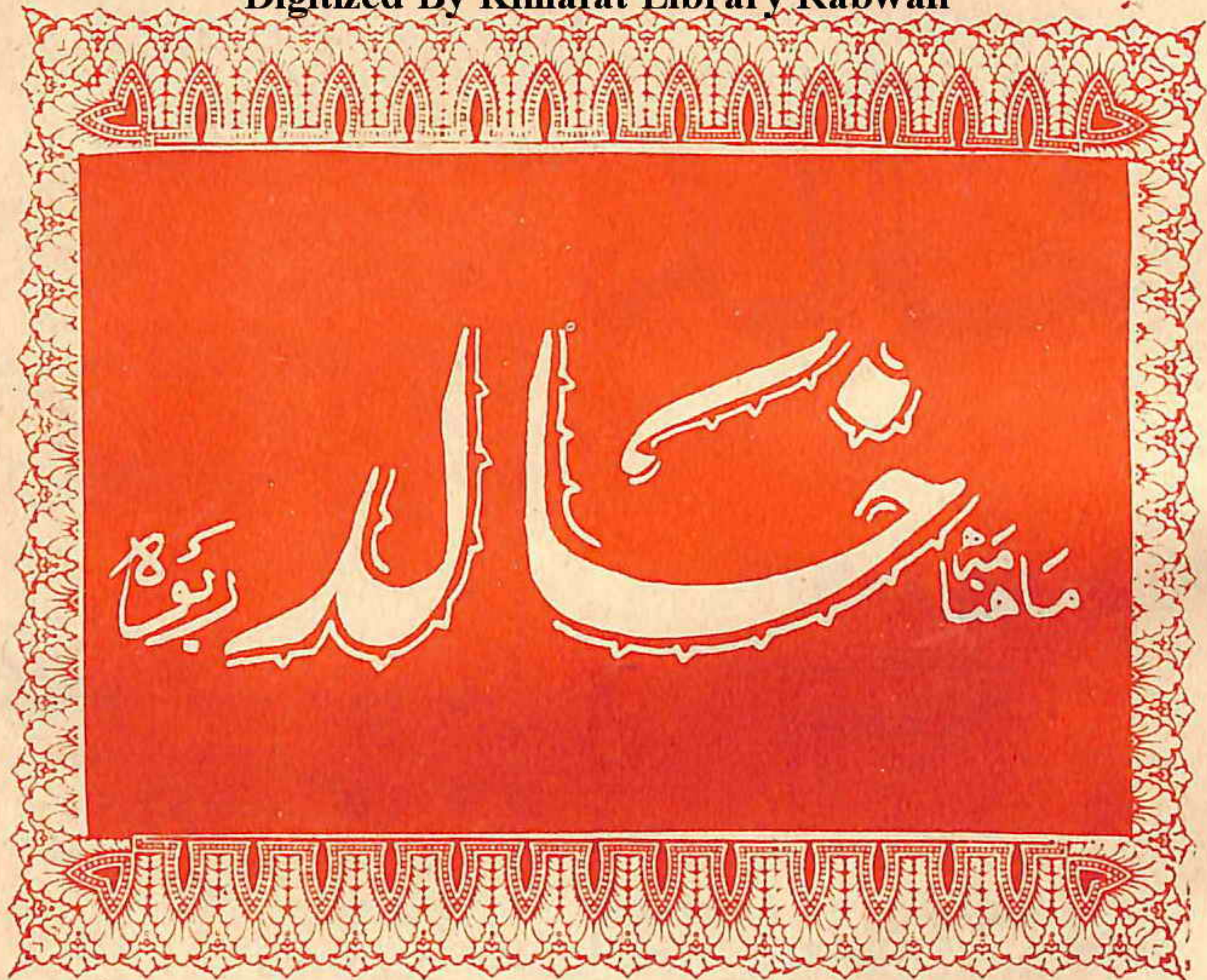
ایڈیٹر:
یوسف سہیل شوق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

خالد

ربوہ

فتح ۱۳۶۷ ہش

دسمبر ۱۹۸۸ء

جلد ۳۶ — شمارہ ۲

قیمت: ماہانہ ۲ روپے پچاس پیسے، سالانہ ۲۵ روپے

ایڈیٹر:

یوسف سہیل شوق ایم۔اے

پبلشر: مبارک احمد خالد ٭ پرنٹر: قاضی منیر احمد ٭ مطبع: ضیاء الاسلام پریس ربوہ

مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ خالد دارالصدر جنوبی۔ ربوہ

اداریہ

انمول موتی کی حفاظت!!

عبادات اور دعاؤں میں ایک نئی لذت اور ایک نیا آہنگ، یہ وہ دولت ہے جو جماعت احمدیہ کو گزشتہ کئی سالوں کے ابتلاء کی صورتِ حال کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ تاریکی میں مولا کے قرب کی روشنی حاصل ہونا ایک ایسا خوبصورت پھل ہے جو اِس دَورِ ماضی نے ہماری جھولیوں میں ڈال دیا ہے۔

یہ دَور ختم ہو رہا ہے یا نہیں، اِس بحث سے قطع نظر زیادہ ضروری سوچ یہ ہے کہ کیا ہم اِس دولت کو اب رائیگاں جانے دیں گے، یہ انمول موتی کیا اب ہم کوڑے کے ڈھیر پہ پھینک دیں گے؟

ہر احمدی کے دل سے یہی صدا بلند ہوگی نہیں! ہرگز نہیں!! دوسری صدی کے آغاز میں آنے والے دن جن فتوحات کی خوشخبریاں لا رہے ہیں آنے والی خیرہ کر دینے والے سورج کی روشنی کی جو واضح علامات اُفق پر ظاہر ہو رہی ہیں، وہ یہ تقاضا کرتی ہیں کہ

نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

حضرت امام جماعت احمدیہ کے فرمان کی روشنی میں یہ انمول موتی تو سنبھال کر رکھنے کے ہیں۔ عبادات اور دعاؤں میں زور تو اب پہلے سے بڑھانا ہے اور اِس موتی کو اب نئی آب و تاب دینی ہوگی۔ فتوحات کا استقبال کرنے کے لئے جس روحانی قوّت کی ضرورت ہے وہ روحانی قوّت اللہ تعالیٰ نے ہمیں ابتلاء کے دَور کے ذریعے عطا کر دی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کی حکمتِ بالغہ نے ہمیں آنے والے وقت کے لیے مستعد کر دیا ہے۔

عبادات اور دعاؤں کی قوّت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ انشاء اللہ العزیز ہر احمدی جاری رکھے گا۔

وباللہ التوفیق۔

حضرت امام جماعت احمدیہ کے زندگی بخش خطبات

بدھ کا دن جماعت احمدیہ کے لئے بہت مبارک ثابت ہوا ہے

خلاصہ خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۸ نومبر ۱۹۸۸ء

حضور نے مختلف دنوں کے منحوس یا سعد ہونے کے بارے میں فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے سوال کے جواب میں بدھ کو منحوس قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس دن فرعون اپنے انجام کو پہنچا تھا اور خدا تعالیٰ کی قہری تجلی اس پر گری۔ اور چونکہ وہ خدا کے غضب کے اظہار کا دن تھا اس لئے وہ منحوس دن قرار پایا۔ حضور نے فرمایا لیکن ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو وہ دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نجات کا بھی دن تھا۔ اس لحاظ سے یہ دن حضرت موسیٰؑ کے لئے مبارک دن تھا۔ حضور نے فرمایا اس لحاظ سے بدھ کا دن ایک پہلو سے منحوس تھا اور ایک پہلو سے بے انتہا مبارک دن تھا۔ جب حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہ کے الہامات کی روشنی میں اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو بدھ کا دن جماعت کے لئے بہت سی برکات کا حامل قرار پاتا ہے۔

حضور نے فرمایا بدھ کا دن جماعت کے لئے یقیناً مبارک دن ہے لیکن اس دن کی برکتوں کے حصول کیلئے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی باقی ہیں اس لئے جماعت کو دعائیں جاری رکھنی چاہئیں اور ساری جماعت کو چاہیئے کہ ان دعاؤں میں شامل ہو جائے۔

دانشوروں کے بارے میں حضور نے فرمایا ایک وہ دانشور ہیں جن کی دانشوری اللہ کی محبت اور بنی نوع انسان سے تلطف اور رحم کے نتیجے میں جلوے دکھاتی ہے اور ایک وہ ہے جس کا مادہ غیظ و غضب اور انتقام ہے اور کچھ احساس کمتری ہے۔ یہ دونوں قسم کے دانشور بالکل مختلف قسم کے اثر معاشرے پر کرتے ہیں۔ ان میں سے جو طبقہ منفی سوچ پیدا کرتا ہے ان کو اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ اُن کو اس پر غور کرنا چاہیئے کہ جب بھی یہ کوئی تنقید کریں تو اپنے دل کو ٹٹولیں کہ یہ تنقید کیا خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے یا اس تنقید نے کسی منفی انتقامی جذبہ کے نتیجہ میں جنم لیا ہے۔ یہ بات ایسے دانشوروں کو اپنی اصلاح کا موقع فراہم کرے گی اور اس کے نتیجہ میں دنیاوی دانشور بننے کی بجائے قرآنی اصطلاح میں اولوا الالباب بننے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

> "ہمارا بہشت ہمارا خدا ہے"۔ (حضرت بانی سلسلہ احمدیہ)

تسبیح و تحمید سے اپنی صبحوں کو بھر دیں

خلاصہ خطبہ جمعہ فرمودہ ۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

حضور نے فرمایا پاکستان میں گیارہ سال کی طویل رات کے بعد جمہوریت کا سورج طلوع ہوا ہے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ صبح کس نوعیت کی ہوگی تاہم جمہوریت کے اس آغاز پر میں تمام اہل پاکستان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ حضور نے فرمایا جو کچھ بھی پاکستان میں رونما ہوا ہے یہ اس سے بہت بہتر ہے جو گیارہ سالہ دور میں ہم نے دیکھا ہے جس میں جماعت احمدیہ نے نہایت صبر اور استقلال کے ساتھ خطرناک مظالم کا سامنا کیا ہے اور ان مظالم کو للہ خدا کی راہ میں برداشت کرتے رہے۔ اب میں امید رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ان مظلوموں کو بھی اس صبح کی روشنی سے حصہ دے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آج نہیں تو کل، اگر کل نہیں تو پرسوں احمدیت پر بھی لازماً وہ سورج طلوع ہوگا جو خدا کا بنایا ہوا سورج ہے اور وہ دن طلوع ہوگا جس کو آپ کی آئندہ کی نسلیں کبھی بھی ڈوبتا ہوا نہیں دیکھیں گی۔ اور میں خدا کی رحمت سے امید رکھتا ہوں کہ وہ دن روشن تر ہوتا چلا جائے گا اور پھیلتا چلا جائیگا۔ یہاں تک کہ ساری دنیا کو دین حق کے نور سے منور کر دے گا۔

حضور نے فرمایا احمدیوں کو اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہمارے سفر لمبے ہیں، ہمارے مقصود اور مطلوب آفاقی ہیں۔ ہم کسی ایک چھوٹی صبح کو دیکھ کر خوشی سے اچھلنے والے لوگ نہیں ہیں۔ ہماری آخری منزل تمام کائنات پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سورج کی صبح کو طلوع کرنا ہے اور تمام عالم کو اس صبح سے روشن کرنا ہے۔ آپ کسی ایک ملک کی جماعت نہیں۔ ایک ملک میں اگر آپ دکھ اٹھاتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی رحمتیں کثرت کے ساتھ دوسرے تمام ملکوں میں آپ کے لیئے رحمت کے سامان پیدا کر رہی ہوتی ہیں۔ اس لیئے نہ آپ کی رات کسی ایک ملک سے بنتی ہے نہ آپ کی صبح کسی ایک ملک سے۔

حضور نے فرمایا میں جماعت کو ایک پیغام دینا چاہتا ہوں کہ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو دنیا میں نمایاں طور پر پھیلانا ہے۔ دوسری صدی کا سورج زیادہ وسیع علاقے پر طلوع ہوگا۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے الہامات سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت احمدیہ اپنی اگلی صدی میں ایک عظیم عالمی جماعت کے طور پر ابھرے گی پس اس پہلو سے تسبیح و تحمید کے ساتھ اپنی صبحوں کو برکتوں سے بھر دینا چاہیئے۔ انشاء اللہ پاکستان میں بھی احمدیت کے حالات پہلے سے بہتر ہوں گے اور مظالم کی اندھیری رات انشاء اللہ ٹل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس بظاہر

جب ایک احمدی کوئی نماز چھوڑتا ہے اُسی وقت وہ احمدیت سے خارج ہو جاتا ہے

ارشادِ باری تعالیٰ

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ (مدثر: ۴۳-۴۴)

ترجمہ: (دوزخیوں سے پوچھا جائے گا) تمہیں کونسی چیز جہنم کی طرف لے گئی۔ وہ جواب دیں گے ہم نمازیں نہیں پڑھا کرتے تھے۔

حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اِنَّ اَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلٰوةُ۔ (کنز العمال)

ترجمہ: بندہ سے سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔

ارشاد حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ

"جو شخص پنجگانہ نماز کا التزام نہیں کرتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔" (کشتی نوح صفحہ ۱۰۹)

ارشاد سیدنا حضرت مصلح موعود

۱۔ "جس وقت کوئی شخص کسی نماز کو چھوڑتا ہے اُسی وقت وہ احمدیت سے خارج ہو جاتا ہے۔" (الفضل ۷ رجون ۱۹۴۲ء)

۲۔ "جو شخص نماز چھوڑتا ہے میں اُس کو یقین دلاتا ہوں کہ اُس کو کبھی بھی ایمان کی موت نصیب نہ ہوگی۔ موت سے پہلے ضرور کوئی ایسا حادثہ اُسے پیش آجائے گا کہ جس کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم ہو جائے گا اور اس طرح وہ بے ایمان ہو کر مرے گا۔" (الفضل ۲۸ ستمبر ۱۹۲۳ء)

ارشاد سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ تعالیٰ

پہلی صدی کے آخر پر مجھے سب سے زیادہ فکر نماز باجماعت کے قیام کی ہے ۔ "میں ہر احمدی سے بڑے عجز کے ساتھ استدعا کرتا ہوں کہ اپنے گھروں میں نمازوں کی حالت کا جائزہ لیں۔ اس معاملہ میں میرے دل میں درد وغم کی ایسی آگ لگی ہوئی ہے کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" (خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۲ جولائی ۱۹۸۸ء)

(تیار کردہ مجلس خدام الاحمدیہ لاہور۔ مرسلہ مہتمم اشاعت مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ)

حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی سادگی، عاجزی، نرمی، عفو

(قسط ۳)

سلطان القلم کا دفتر

حضرت قاضی ظہور الدین صاحب اکمل کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ رحمت اللہ صاحب اور دیگر احباب لاہور تشریف لائے۔ حضور کی طبیعت ناساز تھی فرمایا اندر ہی آجاؤ۔ سب لوگ اندر آ گئے۔ حضور ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے جو معمول سے زیادہ چوڑا تھا۔ اسکے سرہانے ایک چھوٹا میز پڑا تھا۔ اُس پر بہت سی موم بتیاں پڑی تھیں کیونکہ حضور رات کے وقت کئی موم بتیاں بیک وقت روشن کرکے کام کیا کرتے تھے۔ ایک دوات تھی جس کے گرد مٹی تھپی ہوئی تھی۔ دراصل ایک دوات کو رکابی میں رکھ کر اس کے اردگرد مٹی تھوپ دی گئی تھی تاکہ گر نہ پڑے۔ اس پلنگ پر حضور کے جملہ مسودات، کاغذات وغیرہ دھرے رہتے تھے۔ یہیں حضور تصنیف و تالیف کا کام کیا کرتے تھے۔ غرضیکہ یہی حضور کا دفتر تھا جس نے دُنیا بھر کی مذہبی دُنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا حضرت قاضی اکمل صاحب فرماتے ہیں۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد سب لوگ بے تکلفی سے جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے۔ کوئی چارپائی پر، کوئی صندوق پر، کوئی ٹرنک پر، کوئی دہلیز پر، کوئی فرش پر۔ دیر تک یہ پیاسے بیٹھے رہے اور روحانیت کے آبِ رواں سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ حضرت قاضی اکمل صاحب کا بیان ہے کہ حضور کے اس ذاتی کمرہ میں بالکل سادگی تھی۔ فرش پر کوئی دری تک نہ تھی، قالین کا تو ذکر ہی کیا۔ نہ کمرے میں کوئی مکلف سامان یا اعلیٰ فرنیچر تھا۔ حضرت قاضی صاحب کا بیان ہے کہ مَیں نے دیکھا کہ بستر پر جو رضائی پڑی ہوئی تھی وہ بھی پھٹی ہوئی تھی۔ اس کی رُوئی بھی مجھے نظر آرہی تھی۔

(سیرت حضرت مسیح موعود..... شمائل و اخلاق حصہ سوم صہ ۳۱۴، از حضرت شیخ یعقوب علی صاحب تراب عرفانی الکبیر۔ تاریخ اشاعت ۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء، بار اول۔ شائع کردہ انوار احمدیہ بکڈپو قادیان)

حضرت اقدس کے ساتھ ایک رات

حضرت صاحبزادہ پیر سراج الحق صاحب جمالی نعمانی جن کا پہلے ذکر آیا ہے حضرت اقدس کے پُرانے خدام میں سے تھے۔ آپ سرساوہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ آپ کا اور آپ کے والد صاحب کا سلسلہ پیری مریدی بہت مشہور تھا۔

ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ حضور نے اپنے ذاتی ملازم شیخ حامد علی صاحب کو کسی کام کے لئے امرتسر روانہ فرمایا۔ صاحبزادہ پیر سراج الحق صاحب نعمانی کو موقعہ مل گیا حضور کی خدمت میں عرض کی حضور! شیخ حامد علی تو امرتسر چلے گئے رات کو آپ کو تکلیف ہوگی میرا جی چاہتا ہے کہ رات کو بھی آپ کی خدمت مبارک میں رہوں اور جو کام آپ کے ہوں وہ بخوشی دل سے کروں۔ صاحبزادہ صاحب کی مدتوں کی تمنا آج پوری ہوئی کہ حضور کی ذاتی خدمت کا موقعہ ملے گا۔ حضور نے حضرت صاحبزادہ صاحب کی استدعا قبول فرمائی۔ چنانچہ عشاء کے بعد صاحبزادہ صاحب اللہ تعالیٰ کے پاک اور مقدس مسیح موعود کی خدمت میں ایک رات کی خدمتگزاری کے لئے بیت المبارک کی چھت پر حاضر ہو گئے۔

صاحبزادہ صاحب پہنچے تو حضور نے فرمایا صاحبزادہ صاحب آ گئے! صاحبزادہ صاحب نے عرض کیا حضرت آ گیا! حضور اس کے بعد ٹہلتے رہے اور کچھ دعائیں وغیرہ پڑھتے رہے۔ پھر آپ نے کلام مجید یعنی حمائل شریف ہاتھ میں لی اور مغربی منارہ پر لالٹین رکھ کر پڑھتے رہے۔ درمیانی اور باریک آواز میں تلاوت جاری رکھی۔ حضرت صاحبزادہ صاحب بیٹھے رہے۔ کہ جونہی حضور کوئی کام فرمائیں فوراً بجا لائیں۔ صاحبزادہ صاحب نے تہیہ کیا کہ خواہ ساری رات جاگنا پڑے حضور کی خدمت بجا لاؤں گا مگر حضور نے صاحبزادہ صاحب کو کوئی کام ارشاد نہ فرمایا۔ کچھ دیر کے بعد حضور نے اپنا کرتہ اتارا اور تہ بند باندھ لیا۔ گرمیوں کے دن تھے حضور بیت الذکر کے فرش پر لیٹ گئے۔ اس فرش پر چٹائی یا جانماز کوئی چیز نہ تھی محض ننگا فرش تھا حضور سیدھے لیٹ گئے ہاتھ پیر پھیلا دیئے اور فرمایا لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں چارپائی کے بغیر نیند نہیں آتی اور کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ہمیں تو خوب خدا کے فضل سے زمین پر نیند آتی ہے اور ہاضمہ میں بھی کوئی فتور نہیں ہوتا۔

صاحبزادہ صاحب نے موقعہ غنیمت جانا اور حضور کے دراز ہونے کے بعد حضور کے پیر دبانے لگے۔ آپ نے فرمایا صاحبزادہ صاحب رات بہت ہو گئی ہے سو جاؤ۔ تمہیں بہت تکلیف ہوئی۔ ہمارے کام تو چلے ہی جاتے ہیں اور ہمیں کام ہی کیا ہیں۔

صاحبزادہ صاحب نے عرض کیا حضرت مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بہت بہت سفر کیئے، پہاڑی ملک میں جانا پڑا، بدن سدھا ہوا ہے۔ پھر فرمایا تم تو پیر ہو پیروں کو تو عادت ہوتی ہے کہ بغیر چارپائی اور عمدہ بستر کے نیند نہیں آتی میں نیچے سے تمہارے واسطے چارپائی اور بستر گدگدا اچھا سا لاتا ہوں۔ صاحبزادہ یہ بات سن کر اتنے پریشان ہوئے کہ خوف کے مارے جسم کانپنے لگ گیا کہ ایسا نہ ہو حضور یہ تکلیف گوارا کر لیں صاحبزادہ صاحب تو خدمت کے ارادے سے آئے تھے اور اخلاص اور جذبۂ فدائیت سے بھرپور تھے اُن کے جذبات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ وہ فوراً بولے! حضور مجھے زمین پر سونے کی واقعی عادت ہے۔ کیونکہ چھ چھ ماہ اور سال سال بھر کی چلہ کشیاں کی ہیں۔ چارپائی کا نشان بھی نہیں ہوتا تھا۔ اور حضور ایک تھوڑی سی بات کے واسطے تین منزلوں سے نیچے جائیں اور بوجھ لائیں مجھے یہ منظور نہیں۔ اور نیز میرے والد صاحب شاہ حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم جو حضور کے دعوے سے پہلے گزر گئے، انہوں نے بھی یہ عادت ڈالی دی تھی کہ اکثر زمین پر سلاتے۔

اور حالانکہ سب کچھ میسر تھا پھر بھی سردیوں میں گرم کپڑے بنا کر نہ دیتے۔ اگر کوئی کہتا تو فرماتے کہ فقیری اور آرام طلبی جمع نہیں ہو سکتیں۔

حضرت اقدس صاحبزادہ صاحب کی یہ باتیں سن کر خوش ہوئے کیونکہ یہ باتیں خود حضور کے اپنے طرزِ عمل سے موافقت رکھتی تھیں۔ حالانکہ حضور اس زمانے کے پیروں فقیروں کے بے معنی مجاہدات کے مخالف تھے مگر سادگی کی اِن باتوں کو پسند فرمایا اور فرمایا تمہارے والد صاحب کا ایسا کرنا اب کام آ گیا اور ایسا ہی چاہیئے اور احباب کو یہی کرنا چاہیئے کہ آرام طلبی نہ ہو۔ فرمایا ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہمارے دوست و احباب ایسے بن جاویں کہ گویا فرشتے ہیں اور ابھی آسمان سے اُترے ہیں۔ یہ دنیا میں ہوں مگر نہ ہوں۔

حضور دائیں کروٹ لیٹے ہوئے گفتگو فرما رہے تھے اور صاحبزادہ صاحب حضور کا بدنِ مبارک دبا رہے تھے۔ اِس گفتگو کے بعد فرمایا بائیں کروٹ لے لوں۔ صاحبزادہ صاحب نے کہا، حضرت بہت اچھا! حضور اسکے بعد سو گئے اور صاحبزادہ صاحب دباتے رہے۔ مگر چند ہی منٹ کے بعد حضور کی آنکھ کھل گئی۔ صاحبزادہ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا ابھی سوئے نہیں؟ دبا رہے ہو!! صاحبزادہ صاحب بولے، حضور مَیں تو اسی غرض سے آیا تھا۔ پھر فرمایا اچھا اب دائیں طرف کروٹ لے لوں۔ صاحبزادہ صاحب نے عرض کیا بہت اچھا۔ حضور نے کروٹ بدلی صاحبزادہ صاحب دباتے رہے پھر حضور سو گئے۔ صاحبزادہ صاحب کا بیان ہے کہ حضور کا سونا اِس طریق سے تھا کہ دو تین منٹ کبھی چار پانچ منٹ سوتے تھے پھر آنکھ کھلتی اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کر پھر سو جاتے۔ اور آپ کے بائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت ہلتی رہتی تھی جیسے بچے انگلیوں کو حرکت دیا کرتے ہیں۔ چند منٹوں کے بعد جب جاگے تو حکم فرمایا اب سو جاؤ۔ صاحبزادہ صاحب اِس خیال سے کہ تعمیلِ ارشاد ہی ادب کے مطابق ہے حضور کے پیروں کی طرف بیٹھ گئے اور مصلّےٰ جو ساتھ لے کر گئے تھے سرہانے کے طور پر سر کے نیچے رکھ لیا۔ پچھلی رات کو حضرت اقدس بیدار ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ حضور آہستہ آہستہ باریک آواز میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے رہے تاکہ صاحبزادہ صاحب جاگ نہ اُٹھیں اور اُن کی نیند نہ خراب ہو۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد صاحبزادہ صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ حضور آہستہ آواز میں ٹہل ٹہل کر قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ صاحبزادہ صاحب کی آنکھ کھلی تو حضور نے دریافت فرمایا، صاحبزادہ صاحب جاگ اُٹھے؟ انہوں نے عرض کی حضرت جاگ اُٹھا۔ حضور فرمانے لگے صاحبزادہ صاحب وضو کے واسطے پانی لاؤں؟ صاحبزادہ صاحب پھر پریشان ہو گئے کہ مَیں تو اس فرستادہ کی خدمت کے لیئے آیا ہوں یہ اُلٹا میری خدمت پر مستعد ہیں۔ چنانچہ .... صاحبزادہ صاحب نے کہا حضور مَیں تو اس لیئے حاضرِ خدمت ہوا تھا کہ مَیں خدمت کروں آپ تو میری خدمت کے لیئے تیار ہو گئے۔ حضور نے سادگی سے فرمایا اِس میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ بات سُن کر صاحبزادہ صاحب جلدی سے بیدار ہوئے اور نیچے اُتر گئے۔ نیچے جا کر ڈھاب سے وضو کیا اور جلد واپس آ گئے۔ حضور تہجد کے نوافل ادا کر رہے تھے۔ صاحبزادہ صاحب بھی نوافل میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد

اذان کا وقت آگیا حضور نے صاحبزادہ صاحب کو فرمایا اذان کہو۔ صاحبزادہ صاحب نے اذان کہی اور لوگ نماز کے لیئے آنے شروع ہو گئے۔ اس طرح سے صاحبزادہ پیر سراج الحق صاحب نعمانی کی ایک یادگار رات اختتام کو پہنچی۔

نشست و برخاست کی سادگی

حضرت اقدس کی سیرت پر بہت بڑی مقدار میں مواد اکٹھا کرنے کا قابلِ قدر کام حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے انجام دیا۔ آپ حضرت مسیح پاک کے منجھلے صاحبزادے تھے اور حضرت مسیح موعود کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۱۶ سال تھی۔ گویا ہوش کی عمر کے کئی قیمتی سال آپ نے اپنے مقدس والد کے آسمانی وجود کے سائے اور نگرانی میں بسر کیئے اور اس طرح سے آپ کو بڑی باریکی سے حضور کی سیرت کے بارے میں مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا۔ آپ سیرۃ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ پر کئی کتب کے مصنف و مؤلف ہیں۔ حضور کی عام زندگی میں نشست و برخاست میں سادگی کے بارے میں آپ نے اپنی ایک کتاب درِ منثور میں ایک جامع نوٹ لکھا ہے۔ میں یہ نوٹ ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ لطف و محبت کی یہ داستان حضرت صاحبزادہ صاحب کی زبانی سنیئے، آپ لکھتے ہیں:۔

"حضرت بانیٔ سلسلہ کی زندگی تکلفات سے بالکل آزاد تھی۔ ہمارے ماموں جان حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم نے حضرت اقدس کی صحبت میں قریباً ستائیس سال گزارے۔ اور وہ بڑے زیرک اور آنکھیں کھلی رکھنے والے بزرگ تھے۔ وہ مجھ سے اکثر بیان کرتے تھے کہ مجھے دنیا میں بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑا ہے اور میں نے دنیاداروں اور دینداروں سب کو دیکھا اور سب کی صحبت اُٹھائی ہے مگر میں نے حضرت اقدس سے بڑھ کر کوئی شخص تکلفات سے کلی طور پر آزاد نہیں دیکھا۔

اور یہی اس عاجز کا بھی مشاہدہ ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی تمام زندگی ایک قدرتی چشمہ ہے جو اپنے ماحول کے تاثرات سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنے طبعی بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ میں ایک بہت معمولی سی بات بیان کرتا ہوں۔ دنیاداروں بلکہ دین کے میدان میں پیروں اور سجادہ نشینوں تک میں عام طور پر یہ طریق ہے کہ اُن کی مجلسوں میں مختلف لوگوں کے لیئے اُن کی حیثیت اور حالات کے لحاظ سے الگ الگ جگہ ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی اتباع میں حضرت اقدس کی مجلس میں قطعاً ایسا کوئی امتیاز نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ آپ کی مجلس میں ہر طبقہ کے لوگ آپ کے ساتھ اس طرح ملے جلے بیٹھتے تھے کہ جیسے ایک خاندان کے افراد گھر میں مل کر بیٹھتے ہیں۔ اور بسا اوقات اس بے تکلفانہ انداز کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حضرت اقدس بظاہر ادنیٰ جگہ پر بیٹھ جاتے تھے اور دوسرے لوگوں کو غیر شعوری طور پر اچھی جگہ مل جاتی تھی۔ بیسیوں مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ چارپائی

کے سرہانے کی طرف کوئی دوسرا شخص بیٹھا ہوتا تھا اور پائنتی کی طرف حضرت اقدس ہوتے تھے اور چادر وغیرہ والی چارپائی پر آپ کا کوئی مرید بیٹھا ہوتا تھا یا اونچی جگہ پر کوئی مرید ہوتا تھا اور نیچی جگہ میں آپ ہوتے تھے۔ مجلس کی اس بے تکلفانہ صورت کی وجہ سے بعض اوقات ایک نووارد کو دھوکا لگ جاتا تھا کہ حاضر مجلس لوگوں میں سے حضرت اقدس کون ہیں اور کس جگہ تشریف رکھتے ہیں۔ مگر یہ ایک کمال ہے جو صرف خدا کے ماموروں کی جماعتوں میں ہی پایا جاتا ہے کہ اس بے تکلفی کے نتیجہ میں کسی قسم کے بے ادبی کا رنگ پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر شخص کا دل آپ کی محبت اور ادب اور احترام کے انتہائی جذبات سے معمور رہتا تھا۔"

حضور کی محفل میں بے تکلفی کا نظارہ

حضرت اقدس کے منجھلے صاحبزادے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی روایت ہے حضرت جب کسی سے ملتے تھے تو مسکراتے ہوئے ملتے تھے اور ساتھ ہی ملنے والے کی ساری کلفتیں دور ہو جاتی تھیں۔ ہر احمدی یہ محسوس کرتا تھا کہ آپ کی مجلس میں جا کر دل کے سارے غم ڈھل جاتے ہیں۔ بس آپ کے مسکراتے ہوئے چہرے پر نظر پڑی اور سارے جسم میں مسرت کی ایک لہر جاری ہو گئی۔ آپ کی عادت تھی کہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی بات بھی توجہ سے سنتے تھے اور بڑی محبت سے جواب دیتے تھے۔ ہر آدمی اپنی جگہ سمجھتا تھا کہ حضرت صاحب کو بس مجھی سے زیادہ محبت ہے۔ بعض وقت آداب مجلس سے ناواقف عامی لوگ دیر دیر تک اپنے لاتعلق قصے سناتے رہتے تھے اور حضرت صاحب خاموشی کے ساتھ بیٹھے سنتے رہتے اور کبھی کسی سے یہ نہ کہتے کہ اب بس کرو...... آپ کی مجلس میں ہر قسم کی گفتگو ہو جاتی تھی اور ہر آدمی جو بولنا چاہتا تھا بول لیتا تھا۔

سفر ڈیرہ بابا نانک کا واقعہ

آپ کی محفل میں نشست و برخاست کی سادگی کا ایک عملی مظاہرہ حضور کے ڈیرہ بابا نانک کے سفر کے دوران دیکھنے میں آیا۔ حضور وہاں پر حضرت بابا نانک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چولہ دیکھنے تشریف لے گئے تھے۔ اس سفر میں جو ۳۰ ستمبر ۱۸۹۵ء کو پیش آیا چند اور احباب بھی حضور کے ہمرکاب تھے۔ راستہ میں ایک جگہ آپ تشریف فرما تھے کہ علاقے کے لوگ آپ کی آمد کا سن کر ملاقات کو آ گئے۔ آپ محفل میں اس درجہ سادگی اور بے تکلفی سے تشریف فرما تھے کہ ان میں سے بعض کو فوراً شناخت نہ ہو سکی اور انہوں نے جناب مولوی محمد احسن صاحب امروہی کو جو اس سفر میں حضور کے ہمرکاب تھے حضرت مسیح موعود سمجھ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ جناب مولوی صاحب آنے والوں کی غلطی سمجھ گئے اور حضرت اقدس کی طرف اشارہ کر کے آنے والوں کو ان کی غلطی سے آگاہ کر دیا۔ اور یہ محض آپ کی بے تکلفانہ زندگی کا ایک کرشمہ تھا کیونکہ آپ محفل میں اپنے لئے کوئی خاص مسند یا امتیازی جگہ پسند نہ فرماتے تھے اور خدام میں مل جل کر بیٹھا کرتے تھے۔

غزل

(جناب چوہدری محمد علی صاحب مضطرؔ)

ہونے کو وہ شوخ بہت مشہور ہوا　　جانے کیوں بالآخر نامنظور ہوا

اشک پہ جب الزام لگا عُریانی کا　　فرطِ حیا سے اَور بھی چکنا چُور ہوا

مٹتے مٹتے داغ مٹیں گے دامن کے　　چھینٹوں کا یہ دَور بہت بھرپُور ہوا

ننگ دھڑنگ ایک ٹیلہ پیلے پتھر کا　　عشق کی آگ میں جل کر کوہ طُور ہوا

آخر پتھر پگھلا ضبطِ تکلّم سے　　کوہِ ندا کا بَن باسی مجبُور ہوا

اپنے جہلِ مرکّب میں وہ سمجھتا ہے　　میرے قتل سے عنداللہ ماجُور ہوا

دونوں پر اُفتاد پڑی محرومی کی　　ایبٹ آباد ہوا یا لائلپُور ہوا

کٹتے کٹتے رات کٹی مجبوروں کی　　دیکھتے دیکھتے اندھیرا کافُور ہوا

مانگنے والے مانگ کہ اب بھی ملتا ہے　　دل کا چَین ہوا آنکھوں کا نُور ہوا

مضطرؔ ہم بھی عرض کریں گے جاناں سے
فرطِ ادب سے دل نہ اگر مجبور ہوا

جرمنی کب احمدی ہوگا؟

حضرت مصلح موعود کے ارشادات

"پچھلے سال جب مَیں مری میں تھا تو مَیں نے ایک رؤیا دیکھا کہ جرمنی کے مبلغ کا ایک خط آیا ہے کہ جرمنی کا ایک بہت بڑا آدمی احمدی ہو گیا ہے۔ بعد میں رؤیا میں ہی مجھے تار بھی آئی اور اس میں بھی لکھا تھا کہ وہ احمدی ہو گیا ہے اور امید ہے کہ اس کے ذریعہ جرمنی میں جماعت کا اثر و رسوخ بڑھ جائے گا۔"

(بدر قادیان ۲۳ فروری ۱۹۵۷ء)

امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کے ارشادات

سیدنا حضرت مرزا ناصر احمد صاحب امام جماعتِ احمدیہ نے متعدد بار جرمنی اور جرمن قوم کے احمدیت قبول کرنے کے بارے میں ارشادات فرمائے۔

دورہ ۱۹۶۷ء فرینکفرٹ میں احباب جماعت کے درمیان رونق افروز ہونے کے بعد حضور نے اپنا ایک خواب بیان فرمایا۔ حضور نے فرمایا کہ مَیں نے دیکھا کہ ایک جگہ ہے، وہاں ہٹلر بھی موجود ہے وہ حضور کو کہتا ہے کہ آئیں مَیں آپ کو اپنا عجائب خانہ دکھاؤں۔ چنانچہ وہ آپ کو ایک کمرہ میں لے گیا جہاں مختلف اشیاء پڑی ہیں۔ کمرہ کے وسط میں ایک پان کی شکل کا پتھر ہے جیسے دل ہوتا ہے۔ اس پتھر پر (کلمہ) لکھا ہوا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمن قوم اگرچہ اُوپر سے پتھر دل یعنی دین سے بیگانہ نظر آتی ہے مگر اس کے دل میں (احمدیت) قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔"

(الفضل ۱۰ اگست ۱۹۶۷ء صہ)

پچاس سال تک جرمنی احمدیت قبول کرلے گا

دورہ ۱۹۷۳ء -۲۳ اگست ۱۹۷۳ء کو فرینکفرٹ میں ٹیلیویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا۔ "آئندہ پچاس سال تک انشاء اللہ جرمن قوم (احمدیت) قبول کرلیگی ..... مَیں نے عرصہ ہوا خواب میں دیکھا تھا کہ جرمن قوم کے دلوں پر (کلمہ) لکھا ہوا ہے اس لیئے مجھے یقین ہے کہ یہ قوم بالآخر ضرور (احمدی) ہوگی۔"

اسی روز پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

"مجھے یقین ہے کہ پچاس سے سو سال کے اندر اندر اس آسمانی انقلاب کو دنیا عموماً اور جرمن قوم خصوصاً تسلیم کرلے گی۔"

(الفضل ۱۶ ستمبر ۱۹۷۳ء صفحہ اوّل کالم ۲،۴)

مذکورہ بالا پریس کانفرنس کے حوالے سے فرینکفرٹ

کے اخبار FRANKFARTER NEWS PRESSE نے جو خبر دی اس میں لکھا کہ :-

"آپ نے اخبار نویسوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا ایک خواب سُنایا جو آپ نے ۱۹۴۵ء میں جنگِ عظیم دوم کے معاً بعد دیکھا تھا اور جو آپ کی توقعات کو پورا کرنے والا تھا اور وہ یہ کہ ایک وقت آئے گا کہ جرمن قوم بھی قرآن کریم کے سلامتی کے پیغام کو قبول کرے گی"

(الفضل ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ اوّل کالم ۲)

۲۲ اگست ۱۹۷۲ء کو دیئے جانے والے جس ٹیلیویژن انٹرویو کا ذکر پہلے آیا ہے اس کی ایک رپورٹ محترم مولوی فضل الٰہی صاحب انوری کے ذریعے شائع ہوئی اس میں انہوں نے ٹیلی ویژن کے نمائندہ سے حضور کے سوال و جواب درج کئے ہیں، ایک سوال اور اس کا جواب ملاحظہ ہو :-

"نمائندہ : یورپ میں (احمدیت) کے پھیلنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

حضور : خدا کے فضل سے لوگ ۴۰ سے ۵۰ سال کے عرصہ میں کثرت سے (احمدیت) میں داخل ہو جائیں گے"

جرمن قوم یورپ کی قائد ہوگی

حضرت مرزا طاہر احمد صاحب امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ۱۹۸۷ء میں جرمنی کے ایک روزہ دورے کے بعد لندن پہنچنے پر مغربی جرمنی کے نام ایک پیغام ارسال فرمایا۔ حضور نے فرمایا :-

"خصوصاً اس بات سے کہ نئے جرمن احمدی اپنا ایک نیا تشخص قائم کر رہے ہیں اور اپنی بلوغت کی عمر کو پہنچ رہے ہیں مجھے جرمنی کا مستقبل بہت روشن دکھائی دیتا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ سارے مرد اور عورتیں دعوت اِلی اللہ کے کام میں مصروف ہو جائیں گے اور جماعتی کاموں میں بھرپور حصہ لیں گے اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو (احمدیت) میں داخل ہونے پر آمادہ کریں گے۔ یہ جرمنی کی بہتری میں بہت اہم قدم ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ جلد ہی جرمنی کو (احمدیت) کے رنگ میں رنگین کر لیں گے۔ میرے کل کے جرمنی کے مختصر دَورے نے مجھے زیادہ یقین دہانی کروائی ہے کہ انشاء اللہ عظیم جرمن قوم تمام یورپ کی تمام پہلوؤں سے اُن کی قیادت کریگی۔ گو کہ جرمن قوم عیسائیت قبول کرنے میں سب سے آخر میں تھی لیکن انشاء اللہ (احمدیت) قبول کرنے میں سب سے پہلے ہوگی" (ضمیمہ انصار اللہ ستمبر ۱۹۸۷ء صلا)

جرمن احمدیوں کا بلند دینی معیار

"میرا تاثر یہ ہے کہ جرمنی میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی کے غیر معمولی امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک وہاں کی جماعت کا تعلق ہے اس کا ایک بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اُن کے اندر

خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ غیر معمولی جوش پایا جاتا ہے اور قربانی کا بہت مادہ ہے اگر ان کو اچھی طرح سنبھال لیا جائے (اور یہی بات قابلِ توجہ ہے) تو وہ جرمنی کا مستقبل بنانے میں ایک بہت ہی عظیم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اسی طرح جرمن نوجوان بھی اور جرمن خواتین بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہایت ہی اعلیٰ معیار کے احمدی ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو اُن کا معیار اتنا بلند ہے کہ اُن کو دیکھ کر بعض پاکستانی احمدی جو باہر سے آئے ہوئے ہوتے ہیں وہ اُن کے مقابل پر درجہ دوم کے احمدی نظر آنے لگتے ہیں۔" (ضمیمہ ماہنامہ خالد ربوہ۔ نومبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۵)

بقیہ خطبہ جمعہ۔ از صفحہ ۴

تاریک رات سے گزرتے ہوئے ہم نے خدا تعالیٰ کے قرب کی روشنیاں پائی ہیں اور اس سارے دَور میں اگر کوئی ایک شہر پاکستان بھر میں دینی شہر کے طور پر پیش کیا جا سکتا تھا تو وہ ربوہ ہی تھا اور آج بھی ربوہ ہی ہے۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے عبادت کا معیار صرف ربوہ میں ہی نہیں بلکہ سارے پاکستان کے احمدیوں میں بڑھا ہے۔ اور یہ دعائیں کریں کہ اے خدا پاکستان میں جو انقلابی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کے نتیجہ میں احمدی اِن خوبیوں کو چھوڑ نہ بیٹھیں جو مشکل وقتوں نے ان کو عطا کی تھیں۔ بلکہ پہلے سے بڑھ کر ان پر قائم ہو جائیں اور ایسی روشنی کا سورج ان پر طلوع ہو جس میں تیری محبت کا نور ان کے دلوں پر پہلے سے بڑھ جائے۔

قرآن مجید کی ظاہری اور باطنی تاثیرات

(مکرم مولانا بشارت احمد صاحب بشیر)

قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندہ اور دائمی معجزہ ہے جس نے مسلمانوں کو دوسرے معجزات سے بکلی بے نیاز کر دیا ہے۔ دوسرے انبیاء کو بھی معجزات سے نوازا گیا تاہم ان کی تاثیریں وقتی اور عارضی ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ جو "عصائے موسیٰ" کے نام سے مشہور ہے اب اس کا وجود نا پید ہے۔ اس پر دوسرے معجزات کو قیاس کر لیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۞ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۞ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۞

(المائدہ : ۸۳-۸۴)

ترجمہ :- تو مومنوں سے عداوت رکھنے میں یقیناً یہودیوں کو اور ان لوگوں کو جو مشرک ہیں سب سے زیادہ سخت پائے گا۔ اور تو مومنوں سے محبت کرنے کے لحاظ سے اُن میں سے سب سے قریب یقیناً اُن لوگوں کو پائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ بات اِس وجہ سے ہے کہ ان میں کچھ لوگ عالم اور عابد ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ اور جب وہ اِس کلامِ الٰہی کو سُنتے ہیں جو اِس رسولؐ پر اتارا گیا ہے تو اے مخاطب تُو دیکھتا ہے کہ جس قدر حق انہوں نے پہچان لیا ہے اس کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں کے زور سے بہہ پڑتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے ہیں پس ہمارا نام بھی گواہوں کے ساتھ لکھ لے۔

ان کو شاہد اس لیئے کہا ہے کہ ان کا وجود اس نبی کی تعلیم اور روحانیت کا زندہ گواہ ہوتا ہے۔ ان کو دیکھ کو لوگ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کا متبوع کس شان کا ہے۔

قرآن مجید ہی ایک الہامی کتاب ہے جو تشنہ رُوحوں کے لیئے آج بھی آبِ حیات کا کام دے رہی ہے۔

(۱)

امیہ بن ابی الصلت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت سے قبل ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا ترجمہ یہ ہے:-

ہماری قوم میں سے ایک رسول نجران
کی سرزمین سے مبعوث ہوگا جو ہمیں مستقبل
کی خبریں بتائے گا۔

امیہ کچھ عرصہ کے بعد بحرین چلا گیا جہاں اس کا آٹھ سال قیام رہا۔ اس دَوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خلعتِ نبوّت سے مشرف ہو چکے تھے۔ جب وہ واپس آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ آپؐ کے ساتھ اُس وقت صحابہؓ کی ایک جماعت بھی تھی۔ حضورؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور اس کے سامنے سورہ یٰسین اوّل تا آخر تلاوت کی۔ جسے سُن کر وہ ایسا متاثر ہُوا کہ قریب تھا کہ وہ مسلمان ہو جاتا مگر جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوُا اور اس تیزی سے چلا کہ اس کے قدم لڑکھڑاتے تھے۔ قریش بھی اُس کے پیچھے ہو لیئے اور پوچھنے لگے کہ اے امیہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے؟ اُس نے جواباً کہا کہ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ یہ شخص حق پر ہے تب قریش کہنے لگے کہ کیا تُو بھی اِس کا پیرو ہے؟ اُس نے جواب دیا ابھی نہیں جب تک کہ مَیں ہاشمی قبیلہ کا رویہ نہ دیکھ لوں۔ پھر امیہ شام کی طرف چلا گیا اور واقعہ جنگِ بدر کے بعد واپس آیا۔ اس وقت وہ مسلمان ہونا چاہتا تھا مگر جب اس کو مقتولین بدر کی خبر ملی تو اسلام لانے کا ارادہ ترک کر دیا اور طائف کی طرف چلا گیا اور وہیں مر گیا۔

(تفسیر در منثور۔ سورہ مائدہ)

(۲)

نبوّت کے پانچویں سال مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمان وہاں امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن قریش یہ خبریں سُن کر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ شاہِ حبشہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو عبد اللہ بن ربیعہؓ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اِس کام کے لیئے منتخب ہوئے۔ نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لیئے گراں بہا تحفے مہیا کیئے گئے اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی۔ یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباریوں سے ملے اور اُن کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے مُلک میں بھاگ آئے کل ہم بادشاہ کے دربار میں اُن کے متعلق جو درخواست پیش کریں آپ بھی ہماری تائید کریں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہمارے حوالے کر دیئے جائیں۔ درباریوں نے بھی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بُلا بھیجا اور کہا تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بُت پرستی دونوں کے خلاف ہے۔

حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے سوالات کے جواب دیئے۔ نجاشی نے کہا جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبر پر اُترا

ہے کہیں سے پڑھو۔

حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی چند آیات پڑھیں نجاشی پر رقت طاری ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر کہا خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔ یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا۔ تم واپس جاؤ میں اِن مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔ (سیرۃ النبیؐ جلد اول صفحہ ۲۴۰-۲۴۱)

(۳)

حضرت جبیر بن مطعمؓ جو بہت مشہور صحابہ میں سے ہیں اپنے اسلام لانے کا واقعہ بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ مسجد کے پاس سے گزر رہے تھے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں قرآن پڑھتے ہوئے سُنا۔ میں سننے کے لیے ٹھہر گیا جب آپؐ اِس آیت پر پہنچے:۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ○ (الطور: ۳۶)

ترجمہ:۔ کیا ان کو بغیر کسی غرض کے پیدا کیا گیا ہے یا وہ خود ہی اپنے خالق ہیں۔

تو میرا دل کانپنے لگا اور مجھ پر بے خودی چھا گئی۔ چنانچہ اُس وقت سے اسلام کا وقار میرے دل میں جم گیا اور آخر میں مسلمان ہو گیا۔

(۴)

لبید بن ربیعہ جو عرب کے مشہور شاعر تھے۔ جن کے قصائد زریں حروف میں لکھ کر خانہ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیے جاتے تھے۔ جب سورۃ الکوثر خانہ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں دیکھی تو یہ پڑھ کر اس نے کہا "ما ھذا کلام البشر"۔ اس چھوٹی سی سورۃ کا اس کے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ فوراً مسلمان ہو گیا اور فنِّ شاعری سے ہمیشہ کیلئے دستبردار ہو گیا۔ اسلام لانے کے بعد جب کسی نے اُن سے اشعار سننے کی درخواست کی تو ہمیشہ قرآن مجید کی سورۃ پڑھ کر سنا دیتے۔ گویا اپنے عمل سے اِس بات کا اظہار کرتے کہ قرآن مجید ہی اب میری زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

(۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے روز حضرت عمرؓ بن خطاب نے ہاتھ میں تلوار لی اور کہا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں میں اُس کا سر اس تلوار سے قلم کر دوں گا۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ موجود نہ تھے۔ جب آپ تشریف لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے چادر ہٹائی اور آپؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا پھر آپ نے اس بھرے مجمع میں باآوازِ بلند فرمایا:۔

اے لوگو! سُن لو کہ جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا معبود بنایا وہ جان لیں کہ آپ فوت ہو گئے ہیں لیکن خدا کی ذاتِ واحد پر کوئی فنا نہیں وہ زندہ ہے اس پر ہرگز موت وارد نہ ہو گی۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط

(آل عمران: ۱۴۵)

اور محمدؐ صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا اِس آیت کو سُننا تھا کہ بے اختیار

آپ کے ہاتھ سے تلوار زمین پر گر پڑی اور اس کا آپ کے دل پر اور تمام مجمع پر اس قدر اثر ہؤا کہ وہ سمجھنے لگے کہ گویا یہ آیت اِس وقت ہی نازل ہوئی ہے اور پھر اِس آیت کی صحابہؓ بار بار تلاوت کرتے رہے۔ یہ صحابہؓ کا سب سے پہلا اجماع تھا جو کہ وفاتِ مسیح پر ہؤا۔

حضرت خنساءؓ جو زمانۂ جاہلیت اور اسلام کی بہت بڑی شاعرہ تھیں جنہوں نے اپنی شعلہ بیاں شاعری سے اپنی اولاد کو جہاد پر اُکسا کر جامِ شہادت نوش کرنے کی تحریک کی۔ چنانچہ آپ کی سب اولاد نے شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔ ایک مرتبہ انہیں آپ کے عزیز حضرت عمرؓ کے پاس لائے اور شکایت کی کہ سادات مضر کے فراق میں خنساء نے رو رو کر اپنی بصارت کھو دی ہے آپ انہیں کچھ نصیحت کریں۔ چنانچہ آپ حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا:۔

"اے خنساء! کب تک تم اپنے سادات پر ماتم کناں رہو گی۔ اگر کسی نے زندہ رہنا ہوتا تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نے ہی زندہ رہنا تھا"

دولتِ عثمانیہ میں الشیخ بدر الدین قاضی محمود بن اسرائیل جو قاضی کے لقب سے مشہور تھے عسکرِ عثمانیہ میں بڑے اعلیٰ منصب پر فائز تھے بعد میں انہوں نے یہ عہدہ ترک کر کے عزلت نشینی اختیار کر لی اُن کی کتاب "واردات" جو اُن کے الہامات اور روحانی تجربات پر مشتمل ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں کہتے ہیں کہ میں نے جمعہ کے روز ۸۰۵ھ میں ایک رؤیا دیکھی جس میں دو آدمی میرے پاس آئے ہیں ان میں سے ایک نے حضرت عیسیٰؑ کی نعش اٹھائی ہوئی ہے اور دونوں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رُوح کے لحاظ سے تو زندہ ہیں لیکن جسم کے لحاظ سے وفات پا گئے ہیں۔

یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ مجلّہ لواء الاسلام نے اپریل ۱۹۶۳ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات و حیات پر ایک سیمینار منعقد کیا جس میں ہر مکتبۂ فکر کے علماء و فضلاء نے شرکت کی اور مخالف و موافق آراء سننے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ

"قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کا اس جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر جانے کا کوئی ذکر نہیں البتہ تمام انبیاء طبعی وفات پا چکے ہیں"

(بحوالہ مقارنۃ المذاہب احمد شلبی)

(۶)

حاتم روایت کرتے ہیں کہ ملک شام کا باسی جو بہت وجیہہ اور رعب دار تھا حضرت عمرؓ بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ غائب رہا۔ جب کچھ لوگ شام سے حضرت عمر فاروقؓ کی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو آپ نے اس کے بارہ میں دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا۔ امیر المومنین! اُس کا حال مت پوچھئے۔ وہ وہ تو اب مے نوشی میں لت پت رہتا ہے۔ آپ نے یہ سُن کر اُس کے نام ایک خط بایں الفاظ کاتب سے لکھوایا:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یہ خط عمر بن خطاب کی طرف سے بنام فلاں ابن فلاں۔ تجھ پر سلامتی ہو۔ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں"۔

پھر آپ نے سورہ مومن کی یہ ابتدائی آیت لکھی جس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے:۔

جو گناہوں کا بخشنے والا اور توبہ قبول
کرنے والا ہے (اور اس وجہ سے) حمد کا
مستحق ہے سزا دینے میں سخت ہے۔ بڑا
احسان کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود
نہیں۔ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (آیت ۴)

آپ نے قاصد کو یہ خط دے کر تاکید کی کہ وہ یہ خط اس
کے ہاتھ میں دے اور کسی دوسرے کو مت دے۔ آپ
نے حاضرینِ مجلس سے کہا کہ اس کے لیئے دعا کرو کہ خدا
تعالیٰ اس کا دل پھیر دے اور اس کی توبہ قبول فرمائے۔

جب اس کو حضرت فاروق اعظمؓ کا خط ملا تو وہ
اُسے بار بار پڑھتا اور غور کرتا رہا کہ آپ نے مجھے سزا سے
بھی ڈرایا ہے اور معاف کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔
اس کے دل پر قرآن کی اس آیت کا اس قدر اثر ہوا کہ
رقتِ قلب سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے
اور شراب نوشی سے ایسی توبہ کی کہ پھر اس کے قریب
نہ پھٹکا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو جب اس کی خبر ملی تو
آپ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب ہو کر فرمایا:۔

اگر تم اپنے کسی بھائی کو کسی بُری لت میں
مبتلا پاؤ تو اس طرح سب مل کر اس کے لیئے
دعا کرو۔ (تفسیر ابن کثیر الدمشقی)

(۷)

حضرت فضیل بن عیاضؒ کے بارہ میں مشہور ہے
کہ وہ اپنے علاقہ کے ڈاکوؤں کے سردار تھے اور قافلوں
کو لوٹ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ قافلہ کے لوٹنے کیلئے
نکلے۔ جب قافلہ نزدیک پہنچا تو ایک شخص قرآن مجید
کی یہ آیت تلاوت کر رہا تھا:۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ
قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ
مِنَ الْحَقِّ (الحدید: ۱۷)

اب ہم مومنوں سے کہتے ہیں کہ کیا اب
تک اُن کے دل اللہ کے ذکر کے لیئے اور
اس کلام کے لیئے جو حق و حکمت کے ساتھ
اُترا ہے جھکتے نہیں؟

چنانچہ اس آیت کا آپ کے دل پر اس قدر اثر
ہوا کہ اسی وقت آپ نے سچے دل سے توبہ کی اور
بعد میں روحانیت کی منازل اس طرح طے کرتے چلے
گئے کہ آپ قطب بن گئے۔

(۸)

مسلمان مؤرخین نے لکھا ہے کہ سنہ ۴۱۱ھ میں قرامطیوں
کے عبیدی مہدی کے حکم سے خانہ کعبہ سے حجرِ اسود اکھاڑ
کر مصر لے گئے تھے اور ایک روایت کے مطابق ۱۲ سال
بعد اور بعض روایات کے مطابق ۲ سال بعد واپس
لائے تھے۔ اس حاکم عبیدی نے اپنے ایک سردار
ابو الفتوح کے ساتھ ایک دستہ فوج دے کر ان ایام
میں جبکہ ان کا چندروزہ تسلط حجاز پر ہو گیا تھا مدینہ
بھیجا تاکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر
کو مدینہ سے مصر منتقل کریں۔ یہ بد بخت جب روضہ مبارک
کو منہدم کرنے اور جسدِ اطہر کو وہاں سے منتقل کرنے
کے لیئے جمع ہوئے تو مسلمانوں میں سخت اضطراب پھیل
گیا۔ یکایک ایک قاری نے یہ آیت تلاوت کی:۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ
وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ
بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ
فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (التوبہ: ۱۳)

ترجمہ:- اے مومنو! کیا تم اس قوم سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کو اُسکے گھر سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا اور تم سے جنگ چھیڑنے میں انہوں نے ہی ابتداء کی کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو اگر تم مومن ہو تو سمجھ لو کہ اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

یہ آیت ایسی برمحل پڑھی گئی گویا اسی موقع کے لئے نازل ہوئی تھی۔ مسلمانوں میں اِس آیت کا سُننا تھا کہ بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی اور انہوں نے ان خبیثوں کا باوجود ان کی مسلح قوت کے مقابلہ کیا۔ ساتھ ہی آندھی آئی اور یہ خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔

(البدایہ والنہایہ از ابن کثیر)

قرآن مجید کے عجائبات میں سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ خدا کی زبان میں نازل ہوا۔ قرآن کی وحی جبرائیل علیہ السلام لے کر نازل ہوئے قرآن مجید کے الفاظ میں بھی پیشگوئیاں ہیں جو اپنے وقت پہ ظاہر ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ مثلاً سورہ توبہ کی اِس آیت میں هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ یعنی مدینہ کے مشرکین اور مدینہ کے منافقین نے آپ کو مدینہ سے نکالنے کی تجویز کی تھی جس میں وہ ناکام رہے۔ اسی طرح آپ کی وفات کے بعد بھی قرامطیوں نے آپ کے جسدِ اطہر کو مدینہ سے نکال کر مصر لے جانا چاہا لیکن خدائی وعدہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کے مطابق اللہ نے آپ کی حفاظت زندگی میں بھی کی اور زندگی کے بعد بھی کی۔ آپ زندہ نبی ہیں۔ آپ کا فیض اب بھی جاری ہے اور آپ کی متابعت میں ہی دنیا کی نجات ہے۔

(۹)

تاریخِ اسلام کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے خلیفہ بغداد کے دربار میں ایک خط دے کر وفد بھیجا۔ جس میں انہوں نے یہ درخواست کی تھی کہ اب اُن کا نام خطبات میں پڑھا جائے اور مروّجہ سکے پر اُن کا نام کندہ کیا جائے۔ چنانچہ خلیفہ بغداد نے ان کی یہ درخواست رد کر دی۔ پھر سلطان محمود غزنوی نے خلیفہ بغداد کو دوبارہ خط بھجوایا اور ساتھ دھمکی بھی دی کہ اگر اس بار اُس کی درخواست کو شرفِ قبولیت نہ بخشا گیا تو یاد رکھیں میرے پاس اتنے ہاتھی ہیں کہ سارے بغداد کی مٹی ان پر لاد کر لا سکتا ہوں۔ اِس پر خلیفہ نے جواباً جو خط بھیجا اس میں صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا ل م

اور اس پر اپنی مہر لگوا کر لفافہ سربمہر اس کو بھجوا دیا اُدھر جب خط پہنچا تو سلطان محمود نے وہ خط تمام اہلِ مجلس کو دکھایا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ جب علامہ ابوبکر کوہستانی آئے تو سلطان محمود نے وہ خط ان کو دکھایا۔ ابوبکر نے تھوڑی دیر غور کیا پھر کہا شاید آپ نے خلیفہ بغداد کو ہاتھیوں کی دھمکی دی تھی جس کے جواب میں اُس نے یہ حروف لکھے جن سے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے جب ابرہہ نے ہاتھی لیکر بیت اللہ کو منہدم کرنے کی ناپاک اور مذموم جسارت کی تھی انہیں تباہ کر ڈالا تھا اور بعد میں آنے والوں کے لیے یہ واقعہ درسِ عبرت بنا رہا) ابوبکر نے کہا کہ یہ اس واقعہ کی طرف

اشارہ ہے۔ قرآن مجید کے اس واقعہ کا سلطان محمود غزنوی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ اپنے کئے پر سخت نادم ہوا اور خلیفہ کے پاس معذرت نامہ لکھ کر بھیجا۔

(۱۰)

قرآن کریم کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

ویلیز کے جس مترجم کو قرآن مجید کے ترجمہ کی توفیق ملی ان سے ہمارے نعمان صاحب کے ذریعہ جو کہ خود ڈینش ہیں رابطہ ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مترجم اتنے EXCITED (جذباتی) ہوئے کہ انہوں نے کہا کہ یہ اتنی عظیم کتاب ہے کہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس عظمت کی کوئی کتاب ہو سکتی ہے۔ اور جب ترجمہ سُنانا شروع کیا تو بے اختیار رونے لگ جاتے تھے۔ فون کر رہے ہیں اور فون پر ترجمہ سُنا رہے ہیں اور قرآن کے اثر سے انکی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ خود وہ کیتھولک ہیں۔

ایک مترجم نے قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ یہ کتاب حیرت انگیز طور پر عظیم الشان ہے لیکن انتخاب بھی نہایت موزوں ہے اور میں اتنا خوش ہوا ہوں کہ میں نے آپ سے ترجمہ کی فیس کا جو وعدہ لیا تھا کہ میں آپ سے اتنی فیس وصول کروں گا وہ اب نہیں کروں گا۔

(ضمیمہ خالد ستمبر ۱۹۸۸ء صفہ کالم ۲)

قرآن خدا نما ہے خدا کا کلام ہے (درثمین)

تحریر و انٹرویو: یوسف سہیل شوق

میں چھٹیاں گزارنے کراچی پہنچا ہی تھا کہ اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پر نظر پڑی "آج شام پریس کلب میں معروف شاعر عبید اللہ علیم کے نئے مجموعہ کلام "ویران سرائے کا دیا" کی رونمائی کی تقریب ہوگی۔" دل نے فوراً کہا واہ! کیا خوب۔ کراچی میں آمد کا پہلا دن ہی کامیاب گزرے گا۔ شام ہوتے ہی میں پوچھتا پاچھتا پریس کلب پہنچ گیا۔ وہاں دیکھ کر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ پریس کلب کے وسیع و عریض صحن میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ سارا صحن مرد و زن سے پُر تھا عبید اللہ علیم صاحب مداحوں میں گھرے اپنی کتاب پر دستخط کر کے آٹوگراف دے رہے تھے۔ شہر کی نمایاں ترین ادبی اور علمی شخصیات موجود تھیں۔ اتنا وسیع مجمع اور ایسی شاندار تقریب دیکھ کر دل مسرت سے بھر اٹھا۔ احمدیوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے محبت کا جو رشتہ قائم کر رکھا ہے وہ ایسا بے نظیر ہے اور ایسے حیران کن نتائج کا حامل ہے کہ ہر احمدی کو دوسرے احمدی کی خوشی دیکھ کر دلی مسرت حاصل ہوتی ہے جناب عبید اللہ علیم مداحوں سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ لوگ نظروں ہی نظروں میں انکی بلائیں لے رہے تھے اور میں یوں محسوس کر رہا تھا کہ ہر شخص مجھ سے بغل گیر ہو رہا ہے۔ ایک احمدی کی یہ عزت افزائی دیکھ کر دل بے اختیار مولیٰ کریم کی حمد کر رہا تھا۔ تقریب شروع ہوئی تو شہر کے معروف ترین ادباء، شعراء اور نقادوں نے عبید اللہ علیم کی شاعری اور انکی فنکارانہ عظمت کا دل کھول کر اعتراف کیا، لوگ ان کو داد بھی دے رہے تھے اور پیار بھی نچھاور کر رہے تھے لیکن سب سے زیادہ لطف اور سب سے زیادہ مزہ تو مجھے اسوقت آیا جب مہمانِ خصوصی اور کراچی کے علمی و ادبی اور دینی حلقوں کی قابل احترام شخصیت جناب ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے عبید اللہ علیم صاحب کے شعری مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کے بعد کہا کہ چاہے کوئی کچھ کہے اور مجھے کسی نام سے پکارے میں صاف

کہتا ہوں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو محبت میں نے عبیداللہ علیم کی ذات اور کلام میں دیکھی ہے وہ مجھے کسی اور شاعر یا ادیب میں نظر نہیں آئی ۔۔۔ اللہ اکبر! میرا دل کرتا تھا کہ بے اختیار سجدہ میں گر جاؤں۔ کیا داشگاف اعلان تھا ایک احمدی شاعر کی عظمت کا اور کیسا بھرپور اعتراف تھا احمدیت کی ہمہ گیر برکتوں اور زبردست تاثیرات کا!

> **کوئی نظریہ جبتک شاعری کا حصہ نہ بنے جبتک نظریاتی شاعری بیکار ہے**

جناب عبیداللہ علیم کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک معروف ہی نہیں بلکہ مشہور شاعر ہیں۔ جنکی شاعرانہ عظمتوں کے اعتراف میں ان کے پہلے مجموعہ کلام "چاند چہرہ ستارہ آنکھیں" پر مشہور آدم جی ادبی انعام ملا گویا کہ اپنے وقت کی شاعری کی دوڑ میں بفضل خدا اوّل آئے الحمدللہ۔ انکے اس مجموعہ کے ۱۴ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اور تازہ مجموعہ جو ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا اس کے ۴ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

"چاند چہرہ ستارہ آنکھیں" سے لیکر "ویران سرائے کا دیا" تک جناب عبیداللہ علیم نے فن شعر کی کئی منازل طے کی ہیں چنانچہ وہ اپنے ادبی نظریہ اور فنی سفر کے ارتقاء کا ذکر اپنے تازہ مجموعہ "ویران سرائے کا دیا" کے پیش لفظ میں کرتے ہیں۔ یہ حصہ انہی کے الفاظ میں پیش خدمت ہے۔ عبیداللہ علیم تحریر فرماتے ہیں: ۔۔۔ "میں افضل مگر مظلوم آدم کے لشکر کا بہادر سپاہی ہوں۔ میں ابلیسی خودی اور انا کے مقابلے پر آدم کا یقین سپردگی اور دعا کا زادِ سفر لے کے نکلا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ رحمت کے بادل اس ابلیسی آگ کو پھر ٹھنڈا کرنے کے لیے تُلے کھڑے ہیں۔ میرا چاند چہرہ اب دعا دعا چہرہ ہو گیا ہے۔ میری ستارہ آنکھیں اب حیا حیا آنکھیں ہو گئی ہیں۔ میں کسی نظریے یا خیال کے رسمی و تکراری عمل کا شاعر نہیں ہیں اپنے مسلسل ظہور اور اپنی متواتر یقینی پیدائش کا شاعر ہوں۔ میں زمینی اور آسمانی رشتوں محبتوں اور صداقتوں کا شاعر ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ایسے شاعر کیلئے فنا کا قانون منسوخ ہو جاتا ہے"

(ویران سرائے کا دیا صفحہ ۱۴، ۱۵)

ان الفاظ کو خالص جماعتی مجلس میں بیٹھ کر پڑھا اور سنا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مخلص احمدی بے تکلف گفتگو کر رہا ہے اور لطف یہی ہے کہ بصورت دیگر یہ الفاظ عام غیر احمدی کیلئے بھی اتنے ہی قابل قبول اور بامعنی ہیں۔

> **ہمارے بزرگوں نے ہمیں شعر کہنے کے بڑے زبردست راستے سمجھا دیئے ہیں**

جناب عبیداللہ علیم جب بھی ربوہ آتے رہے محفلیں لوٹ کر لے جاتے رہے۔ اس دفعہ ہم نے انہیں لوٹنے کی ٹھانی وہ ربوہ آئے مجلس مشاورت کی ایک شام ہم نے انہیں جا پکڑا۔ ہمارے ساتھ مرزا خلیل احمد قمر صاحب نائب ایڈیٹر خالد بھی تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو اس وقت ہوش آئی جب نصف شب گزرنے کے قریب تھی لیکن یہ انٹرویو نہ تھا۔ اگلے روز انٹرویو کا وقت مقرر ہوا اور آج ان کا انٹرویو کرنے والوں میں خاکسار راقم الحروف یوسف سہیل شوق ایڈیٹر خالد کے علاوہ مکرم مرزا خلیل احمد قمر نائب ایڈیٹر خالد اور معاون مکرم مولوی فضل احمد صاحب شاہد مربی سلسلہ شامل تھے

ذاتی تعارف

مکرم عبیداللہ علیم صاحب سے ہم نے گزارش کی کہ سب سے پہلے اپنا ذاتی تعارف کروائیے۔ آپ کہاں پیدا ہوئے فیملی بیک گراؤنڈ سے آگاہ فرمائیں۔

مکرم علیم صاحب بولے۔ میں ۱۹۳۹ء میں بھوپال میں گرمیوں کے کسی مہینہ میں پیدا ہوا۔ ہمارے والد صاحب مرحوم رحمت اللہ بٹ صاحب سیالکوٹ سے بھوپال تشریف لے گئے تھے۔ اور مولوی جان محمد صاحب جو میرے دادا تھے وہ بھی ساتھ گئے تھے۔ وہ کچھ دن وہاں رہتے تھے اور کچھ دن قادیان آجاتے تھے۔ میرے والد صاحب کوئی ۳۵ سال بھوپال میں رہے لیکن ہمارے سارے بھائیوں نے قادیان میں ہوسٹل میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۴۶ء میں میں نے بھی ایک سال کیلئے قادیان میں تعلیم حاصل کی میں اسوقت تیسری کلاس میں تھا۔ اس

کے علاوہ ۱۹۴۶ء کا جلسہ بھی میں نے دیکھا۔ میرے والد صاحب اوورسیئر کی حیثیت سے بھوپال گئے بعد میں وہ انجنیئر ہوئے اور پھر اپنے
علاقے کے بہت بڑے زمینداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں ہم کراچی آ کر آباد ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد جنگ شاہی چلے گئے۔
بعد ازاں واہ میں آ گئے جہاں میرے والد صاحب ملازم تھے۔ ۱۹۵۴ء میں مجھ میں لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کے آثار پیدا ہوئے۔ اس وقت
میری عمر ۱۴، ۱۵ سال کی تھی۔ وہاں کے امیر صاحب جن کا اسم گرامی بھی مجھے اب یاد نہیں بہت ہی محبت کرنیوالے بزرگ تھے اُس زمانے میں ان کے ذریعے
مجھے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی کتب پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس شہر میں مولویوں سے احمدیت پر بحث کرنا مجھے یاد ہے۔ میرے والد صاحب کے
اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے۔ وہاں سے بھوپال گئے۔ میری تعلیم کا سلسلہ ابتدا ہی میں منقطع ہو گیا تھا۔ ۵۵/۱۹۵۴ء میں جب
میں کراچی واپس آیا تو نائٹ سکولوں میں ایک ایک سال میں ڈبل ڈبل کر کے تعلیمی مدارج طے کیے۔ تعلیمی زندگی میں سکول کے میگزین کا نائب ایڈیٹر بنایا جاتا
اور بیت بازی کے مقابلوں میں سبقت لے جانا یاد ہے۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے غالباً ۱۹۵۶ء کا کہ ہم نے اپنی ایک تُک بندی المصلح میں چھپنے
کیلئے بھیجی اس پر ہمارے شفیع اشرف صاحب نے لکھ دیا کہ اسے نظم سمجھیں یا نثر سمجھیں؟ لیکن چھاپ بھی دی۔

" یعنی حیرانگی کی بات ہے کہ چھاپ بھی دی اور لکھ بھی دیا "

جی ہاں! انہوں نے چھاپ دی یہ بات اب ظاہر ہے کہ یہ ایک بچے کیلئے بڑے صدمے کی بات تھی۔ کیونکہ بات یہ تھی کہ اس نے ہم عصروں
میں کئی جگہ یہ نظم سنائی بھی تھی اور شروع شروع میں یہی ہوتا ہے اور جب کوئی چیز چھپتی ہے تو آدمی بغل میں رکھ لیتا
ہے کہ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔ تو کسی طور پر کوئی دعا کا عمل جاری ہوا کہ ہم کچھ لکھ ہی نہیں
سکتے اب لکھنے کی تمنا بھی ہے اور طبیعت بھی موزوں نہیں ہے یعنی کچھ ایسا احساس ہونے
لگا کہ طبیعت ہی موزوں نہیں ہے۔ اس میں میں یہ واقعہ بتانا کبھی نہیں بھولوں گا کہ میں نے ہمیشہ اپنے
ذہن میں رکھا اور لاشعور میں یہ بات بالکل جم گئی ہے کہ میرے ایک دوست ہوتے تھے عبدالواحد صاحب
بزرگ تھے، احمدیہ ہال میں ہم ان کے پاس جایا کرتے تھے، وہ بڑے پیار سے بچوں سے ملا کرتے تھے اور رفیق بانی
سلسلہ تھے تو ہم نے ان سے جا کر کہا کہ ہمیں اس بات کا بڑا صدمہ ہے اور آپ ہمارے لیے دعا کریں کہ ہم بھی لکھ سکیں تو انہوں نے فرمایا کہ
میں تمہارے لیے ضرور دعا کروں گا۔ ہم انکی خدمت کر دیا کرتے تھے پاؤں ہاتھ دبا دیتے وغیرہ۔ سکول کی زندگی سے فارغ ہو کر پوسٹ آفس
میں کلرکی کی دو سال بعد اردو کالج میں فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا۔ یہاں ہماری ادبی ٹریننگ کا آغاز ہوا۔

احمدی شاعر کے سوا کسی کے پاس طاقتِ گفتار نہیں

مَیں نے بیاض جلا دی

لیکن ۱۹۵۹ء تک جتنے بھی میں نے شعر لکھے اور دو چار غزلیں جو کہیں چھپ گئیں۔ اس ساری کی
ساری بیاض کو میں نے جلا دیا۔ اور اس دو سال میں اتنا کلام لکھا میں نے کہ جو اس وقت تک کی ساری
زندگی میں اب تک نہیں لکھا۔

" اس کو جلانے کی کیا وجہ بنی؟ "

مجھے اس بات کا تھوڑا سا احساس ہوا کہ شعر لکھنے سے پہلے شاعر کی ایک تیاری ہوتی ہے۔ جہاں اسے بڑے زمانے تک یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ
شعر میں اسکی آواز آنی شروع ہوئی ہے یا نہیں، ذاتی مشاہدہ یا تجربہ اس کے شعر میں داخل ہوا یا نہیں، ذاتی مشاہدہ یا تجربہ کی لذت سے جو شعر
پیدا ہوتا ہے وہ ہوتا ہی کچھ اور چیز ہے۔ ۱۹۵۹ء میں پہلی دفعہ مجھے یہ احساس ہوا کہ اب میرے اندر شعر لکھنے کی قوت سچ مچ پیدا ہو گئی ہے
یعنی اسمیں میں وہ بات کہنے لگا ہوں جو مجھ پر گزرتی تھی۔ اب یہ نہیں تھا کہ کوئی غزل لکھ رہے ہیں تو اس میں قافیے کی ضرورت کے تحت
شعر لکھ دیا، کوئی مصرعہ آ رہا ہے تو اسی مصرعے کو پکڑ لیا اور لکھ دیا۔ اس کے بعد وہ رویّہ پیدا ہونا شروع ہوا کہ جہاں سے اپنا غم اور
اپنا رویّہ اور اپنی ذات تھی وہ مائل کرنے لگی کہ یہ حقائق ہیں۔

پہلا بڑا مشاعرہ

پہلا مشاعرہ، بڑا مشاعرہ میں نے کراچی یونیورسٹی میں پڑھا اسوقت میں اردو کالج کا طالبعلم تھا۔ یہ ۱۹۵۹ء
کی بات ہے۔ آپکو معلوم ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالج میں ہوٹنگ کی بھی ایک سطح ہوتی ہے جو بہت ہی غیر معمولی ہوتی ہے۔ اسمیں مجھے ہوٹ تو
نہیں کیا گیا کیونکہ اردو کالج سے یونیورسٹی اس زمانے میں بالکل نزدیک تھی اور کیونکہ یونیورسٹی کے لوگ بھی ہمیں جانتے تھے لیکن جب میں سٹیج پر گیا تو میرا گلا بالکل خشک ہو گیا تھا اور ایک دو شعر پڑھنے

کے بعد یہ کیفیت ہو گئی کہ میں اپنے آپ کو خود ہی ہُوٹ کرنے لگا۔ تو لوگوں نے بھی "ہمت افزائی" کی۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ میرے اندر ایک حوصلے کی کیفیت پیدا ہوئی اور پھر جب ہم اپنے کالج کی زندگی میں واپس آئے تو ذرا اونچی ادبی محفلوں میں جانا شروع کیا۔

شاعری کیساتھ سیاست

اس دوران جو ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء لگا اس میں آزادی کی فضاء پر جو بوجھ پڑا وہ ہماری شخصی زندگی پر بھی پڑا اور اس سے ہمارے اندر ایک زبردست عمل پیدا ہوا اور اس زمانے کی جو سیاسی تحریکیں مارشل لاء کے خلاف چل رہی تھیں ہم ان سب میں باقاعدگی سے دلچسپی لینے لگے۔ لہٰذا ۱۹۶۱ء میں ہمیں آٹھ لڑکوں سمیت کالج سے نکال دیا گیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ہم نے کالج میں بعض ایسی گستاخیاں کی تھیں کہ امتحان نہیں منعقد ہونے دیئے وغیرہ وغیرہ اور ہمارے پیچھے سی آئی ڈی وغیرہ لگ گئی۔ ہمارا تعلق پروگریسو تنظیموں این ایس ایف وغیرہ سے تھا۔ ۱۹۶۱ء میں ہم نے انٹر پاس کیا۔ یونیورسٹی میں ہمیں تکنیکی ترکیب اور سفارش سے بی اے آنرز میں داخلہ مل گیا۔

" آپکی گفتگو سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی سیاسی مقبولیت کی وجہ سیاسی شاعری ہی تھی "

ہاں! لیکن سیاسی شاعری اُس قسم کی نہیں تھی جیسی آجکل لوگ ڈائریکٹ قسم کی کرتے ہیں بلکہ اسمیں باغیانہ قسم کا جوش اور بیانیہ قوت بھی تھی۔ اب اس مرحلے پر آکر طلبار شاعروں میں ہمیں اولیت حاصل ہو گئی۔ بہت ہی مقبول شعراء میں ہمارا شمار ہونے لگا۔

گھر سے نکال دیا گیا

چھ آٹھ مہینے کے بعد ہم اپنے معاشی حالات کی وجہ سے اس قابل نہیں تھے کہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہمیں ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ جیلانی صاحب نے کہا بھی کہ ہم تمام خرچ اٹھائیں گے مگر ہم اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ مالی حالات کی وجہ سے یونیورسٹی کے اس دور میں دُکھ اٹھانے کے واقعات غیر معمولی ہیں۔ والد صاحب نے گھر سے نکال دیا کہ آپ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ کتابیں ہماری ان کے نزدیک بیکار تھیں کہ فضول شاعری میں حصہ لیتے ہیں آپ، گھر میں شاعری کی کوئی روایت دُور تک نہیں تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ لڑکا بالکل ہی برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر طرف گمنامی اور رسوائی کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ گھر سے جب ہم کو نکالا گیا تو کوئی تین چار مہینے ہم گھر سے باہر رہے تو کبھی کہیں سو گئے کبھی کہیں چلے گئے پھر صبح یونیورسٹی چلے گئے۔ کپڑے کہیں پڑے ہیں۔ کبھی کسی نے دھو دیئے نہیں بھی دُھلے۔ اس زمانے میں ہمارا گزارے کا طریق یہ تھا کہ کبھی کمرشل سروس سے، کبھی کسی مشاعرے سے اور کبھی اپنے بھائی سے کچھ پیسے ویسے لے لیا کرتے تھے۔ اور اس طرح سے ۱۹۶۱ء میں ہم اس قابل نہ رہے کہ باقاعدہ تعلیم جاری رکھ سکیں۔ پھر ہم نے کسٹوڈین کے ایک محکمہ میں نوکری کی۔ اور شعر کا یہ شغف ہونے لگا کہ ہم بہت دیر تک راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگے کبھی کہیں مشاعرہ کبھی کہیں روز ہی رات کو کہیں نہ کہیں مشاعرہ یا ادبی نشست۔ یونیورسٹی میں ہر ڈیپارٹمنٹ ہی میں ان دنوں مباحثے ہوا کرتے تھے۔ تو ۱۹۶۱-۶۲ء میں ہماری یہ شہرت ہو گئی کہ لوگ خاص ہمیں سننے کے لیے باقاعدہ بلانے لگے اور یونیورسٹی کی فضا میں ہمیں خاصی مقبولیت رہی۔ یہ جو نوکری کی تو ۱۹۶۳ء میں دوبارہ چھوڑ دی اور پھر ہم نے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹس کو جوائن کیا۔ اسمیں ہماری ٹھیک ٹھاک نوکری تھی اس زمانے کے لحاظ تین چار سو روپے ملتے تھے وہ بھی ہم نے تھوڑی دیر کے بعد چھوڑ دی اور پھر ہم نے بی اے پاس کیا فرسٹ کلاس ہیں۔ ہمارے مضامین تھے مابعد الطبیعات اور ایڈوانس اردو۔

زیادہ مظلوم اس صدی میں

" اردو تو آپ کے گھر کی لونڈی تھی نا "

نہیں لونڈی تو کیا ہوتی تھی ......

" بس یہ ہے کہ کہیں بے نکاحی نہ ہو۔ (عبیداللہ علیم صاحب کے چہرے پر سوالیہ نشانات پیدا ہوئے تو ہم نے وضاحت کی کہ ایک بار عبدالمجید سالک صاحب نے کسی اہلِ زبان کی تحریر میں کوئی غلطی نکالی تو اس اہلِ زبان نے بگڑ کر کہا کہ آجاتے ہیں یہ پنجابی اردو کا درس دینے اردو تو ہمارے گھر کی لونڈی ہے۔ حضرت سالک کہاں چوکنے والے تھے فوراً بولے۔ اس سے انکار نہیں کہ اردو آپ کے گھر کی لونڈی ہے ہمیں صرف اس پر اعتراض ہے کہ آپ نے بے نکاحی گھر میں رکھی ہوئی ہے۔ جناب علیم

یہ لطیفہ سن کر بیحد محظوظ ہوئے ۔ جناب علیم دوبارہ اسی ڈوبے ہوئے مخصوص لہجے میں گویا ہوئے کہ ہم نے اسطرح بی اے پاس کیا " گویا کہ اسقدر مصائب کے باوجود آپ نے بی اے اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا "

۱۹۵۹ء میں اگرچہ ہم جماعتی طور پر بھی سرگرم کارکن تھے ۔ نائب ناظم اصلاح و ارشاد کا عہدہ تھا اور مولوی صاحبان سے بھی مباحثے جاری رہتے تھے لیکن شاعری کے پیچھے لگ کر بہت خراب ہوئے ۔

شعری زندگی کا اہم ترین لمحہ

تاہم اس لگ بھگ عرصے میں ایک نہایت ہی ایمان افروز واقعہ ہمارے ساتھ پیش آیا ۔ یہ ۶۴-۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ میں نے حضرت فضل عمرؓ کی ذات پر اشعار لکھے اور تھوڑے بہت نہیں بلکہ الفضل کے آدھے صفحے پر شائع ہوئے اور اس کے کوئی ایک ہفتے کے بعد مجھے حضور کے پرائیویٹ سیکرٹری کا خط ملا کہ حضور نے آپکی نظم پڑھی اور آپکے لیے بہت دعا کی ۔ بس جناب وہ دن اور آج کا دن کہ ہماری ساری شخصی خامیاں یک قلم ہم سے رخصت ہوگئیں ۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی تاحال کر رہا ہے ۔ لیکن اصل بات یہ ہوئی کہ ہمارے شعری قویٰ میں انتہائی غیر معمولی ترقی ہوئی کہ ہم اسے قیاس میں بھی نہیں لاسکتے تھے پہلے جو ہم نے ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۱ء تک کے لگ بھگ شعر لکھے ۔ پھر اس سے یکسر ہی کوئی نئی چیز پیدا ہو گئی ایک تو وہ بزرگ کی دعا جن کی وجہ سے ہماری طبیعت میں شعر لکھنے کی طرف موزونی پیدا ہوئی ۔ اور دوسرا یہ خط جس نے گویا کایا ہی پلٹ کر رکھ دی ۔ ایک چھوٹے سے کارڈ پر جواب آیا تھا اس نے میری ذاتی زندگی پر بغیر میرے کسی عمل کے اتنا بڑا اثر ڈالا کہ میری زندگی ہی بدل کر رہ گئی ۔ یعنی وہ قصیدہ میں نے کس طرح لکھا تھا یہ اب بھی مجھے علم نہیں ہے اور شاید آج بھی میں ویسا لکھنے کی طاقت نہیں رکھتا ۔ ۶۴-۱۹۶۳ء تک حالت یہ ہو گئی کہ ہم کراچی میں جو شعر کہتے تھے اسکا ذکر پاکستان کے دوسرے کونے کے ادبی حلقوں میں پہنچ جاتا تھا یعنی لاہور، پشاور وغیرہ تک ۔ میں پہلی دفعہ چھپا ہوں "نقوش" میں ۶۳ء میں اور اس سے پہلے "لیل و نہار" اور "ادب لطیف" میں بھی چھپا ۔ ۱۹۵۹ء سے میں نے جو کچھ بھی لکھا وہ میرے مجموعوں میں شامل ہے ۔ اسمیں سے میں نے کچھ نہیں نکالا ۔ حالانکہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک کے کلام کی سو ڈیڑھ سو غزلیں میں نے جلادیں لیکن ۱۹۵۹ء کے بعد کا سارا کلام محفوظ ہے اور بفضلہ مجھے یاد بھی ہے ۔ پھر ہم نے ۱۹۶۷ء میں ٹیلی ویژن جوائن کیا ۔

احمدی شعراء کو حضرت مصلح موعود کا لب ولہجہ اپنانا چاہیئے

کسی احمدی شاعر کی بدنصیبی

کسی بھی احمدی شاعر کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ شہرت کی تمنا میں اور مقبولیت کی تمنا میں اپنی احمدیت کو چھپالے اور اسکا اظہار نہ کرے تو میں نے ایسے شعراء کو دیکھا ہے کہ کوئی بھی حیثیت انہوں نے حاصل نہیں کی اور یہ بھی عرض کر دوں کہ مجھے میری طالبعلمی کے زمانہ میں ایک بار محض احمدی ہونے کی وجہ سے کلاس روم سے نکال دیا گیا ۔ دینیات کی کلاس تھی اس میں کچھ سوالات ہم نے ایسے کیے تھے ۔ یہ بات ہوگی کوئی ۵۹ء کی ۔ تو پروگریسو طلباء جو تھے کلاس میں انہوں نے استاد سے کہا کہ ان سوالوں کے جواب تو آپ کو دینے چاہئیں ۔ ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی تمام صفات زندہ اور پائندہ ہیں تو صفتِ کلام کا کیا ہوا ۔ وہ مولانا متین خطیب صاحب تھے ۔ میرے اس سوال پر اتنے برافروختہ ہوئے کہ کہا کہ تم کلاس سے نکل جاؤ اور ہمیشہ کیلئے تم نے کلاس میں نہیں آنا ۔ انہوں نے کلاس روم میں مجھ سے پوچھا کہ آپ قادیانی ہیں ؟ میں نے کہا ہاں الحمدللہ

" یعنی وہ آپ کے سوال سے ہی سمجھ گئے تھے کہ آپ کون ہیں ؟ "

جی ہاں اسوقت میری چھوٹی والی داڑھی جو بعض احمدی رکھ لیتے تھے وہ ہوا کرتی تھی ۔ ۱۹۶۵ء تک وہ داڑھی رہی ۔ یعنی جس زمانے میں میں نے بیشمار مشاعرے پڑھے اس وقت میری چھوٹی داڑھی موجود تھی جس سے صاف پتہ چل جاتا تھا کہ یہ شخص احمدی ہے ۔ یہ ایک ایسا پریشر تھا ۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ میں این ایس ایف کی جو ترقی پسندانہ موومنٹ تھی ۔ اس سے اتفاق تو طبعاً نہیں کرتا تھا لیکن وہ مجھے سوٹ کرتی تھی مولوی صاحب کے مقابلے میں ۔ اور ان سے جو میری جنگ تھی وہ بھی ساتھ ساتھ جاری تھی ۔ لہذا میرے اس انداز سے جو سیاسی خوشی پیدا ہوئے وہ عام شاعری سے بالکل مختلف پیدا ہونے شروع ہوئے ۔ ایک تو اس پریشر کی وجہ سے وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ شخص احمدی ہے

اسے مشاعروں میں نہیں آنا چاہیئے لہٰذا اس زمانے کے جتنے بزرگ شاعر تھے مولانا ماہر القادری، تابش دہلوی، راغب مراد آبادی، یہ لوگ سٹوڈنٹس کے مشاعروں میں کئی دفعہ یہ کہتے تھے کہ کیا عبیداللہ علیم آئیں گے اور بعض اوقات دھمکی دے دیتے تھے کہ اگر وہ آئیں گے تو ہم نہیں آئیں گے۔

شاعری کے عوامل کی ضرورت

۱۹۳۶ء کی جو ترقی پسندانہ مومنٹ چلی تھی اس سے ہمیں قطعی طور پر اختلاف تھا کیونکہ وہ ساری کی ساری بیانیہ شاعری تھی۔ اب صرف نقطۂ نظر کے اظہار سے شاعری بڑی نہیں ہو جاتی اسمیں ہمیں اختلاف یہ تھا کہ کوئی نقطۂ نظر جب تک انسان کا وجود نہ بن جائے اور اس میں شاعرانہ عوامل اور کیفیات زندہ نہ ہو جائیں اور وہ محرکات زندہ نہ ہوں، جو تقابلی شاعری میں شاعر ہونے کا ثبوت نہ فراہم کریں تب تک وہ اگر نظریے کی شاعری بھی ہے تو بیکار شاعری ہے۔ اسلیئے کہ اگر آپ نے کسی نظریے کو بیان بھی کر دیا۔ یعنی آپ نے شعر لکھا کہ "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں" اس کی حکمت و بلاغت پر میرا ایمان ہے لیکن اگر یہ بات بعینہٖ اسی طرح آئیگی تو یہ بات شعری اوصاف سے محروم رہے گی۔ ان کیفیات کو شاعر کیسے بیان کرے۔ مثلاً میں بتاتا ہوں کہ اس کیفیت کو ایک شاعر نے کیسے بیان کیا۔ یہی بات وہ کہہ رہا ہے۔ غالب نے لکھا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

یہ اس نے کلمے کو ہی لکھا ہے اب یہ جو حکمت و بلاغت تھی یہ ترقی پسندوں میں نہیں تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے رومانٹک لب و لہجے بھی موجود تھے مثلاً ساحر لدھیانوی تھے جنہوں نے کہا

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
یہ تبسم یہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

اور پھر زور دار معیشت کی نظمیں آئیں کہ ہم ماردیں گے توڑ دیں گے، انقلاب زندہ باد۔ روٹی کپڑا اور مکان کی باتیں۔ وہ بھی تھیں۔

کراچی کی ادبی زندگی کا انوکھا واقعہ

جناب علیم صاحب روانی اور تسلسل سے گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے ۱۹۷۴ء سے اپنی بات دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا کہ) ۱۹۷۴ء میں میری کتاب آئی "چاند چہرہ ستارہ آنکھیں" یہ کتاب کراچی کی ادبی زندگی کا پہلا واقعہ ہے!

"کس اعتبار سے؟"

اس اعتبار سے کہ کراچی میں کتابیں نہیں چھپتی تھیں۔ لاہور کتابیں چھاپتا تھا اس کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ جسے چاہے شاعر بنائے جسے چاہے کنڈم کر کے رکھ دے۔ جو ایک آدھ کتاب شائع بھی ہوئی اس کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ کسی اہم شاعر کی کتاب وہاں سے نہیں چھپتی تھی تو ہم نے ایک روایت تو یہ ڈالی کہ ہم نے اس کتاب کا سوونیئر چھاپا جسمیں کہ بیشمار ادیبوں کی آراء شامل تھیں۔ دوسرا یہ کہ اسکا افتتاح پریس کلب میں ہوا۔ اور بقول ابن انشاء کے وہ کتاب کے افتتاح سے زیادہ عرس تھا۔ اتنے افراد نے شرکت کی اسمیں ہر طبقہ فکر کے لوگ اور بیشمار مضامین اخباروں میں رسائل میں اس زمانے میں چھپے۔ تو ہماری کتاب کو ۱۹۷۴ء کا ادبی انعام بھی ملا۔ آدم جی انعام۔ جس میں پھر میری ذات آڑے آئی کہ میں نے اسکا ذکر کتاب پر نہیں چھپنے دیا کبھی۔ بعض لوگ لکھتے ہیں کہ آدم جی انعام یافتہ۔ میں نے اپنی کتاب کے سرورق پر کبھی اس کا ذکر نہیں ہونے دیا۔

"آج تک ــــ؟"

آج تک اور اس کتاب کا چودھواں ایڈیشن چھپے گا اور اب دانیال پبلشرز وہ کتاب چھاپتے ہیں۔

"پہلے تو شاید سیپ نے چھاپی تھی؟"

پہلے سیپ نے چھاپی تھی! تو اس کے بعد پھر ادبی مباحث کی شکل ہی بدل گئی۔ اس دوران ایک اور ذکر جو ہے وہ بہت ضروری ہے۔ کہ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۴ء تک چاند چہرہ ستارہ آنکھیں کی آدھی غزلیں گانے والوں نے گا دی تھیں۔ اور ریڈیو سے اور T.V سے بھی کبھی کبھار۔ کیونکہ میں ملازم تھا T.V کا۔ اس لیے میرا کلام نشر کرنے پر پابندی تھی۔ لیکن مجبوری میں انہیں بعض چیزیں دینی پڑتی تھیں اور یہ بات بہت ہی اہم ہے

کہ ٹیلی ویژن میں ملازمت کے دوران مجھ پر مشاعرہ پڑھنے پر بھی پابندی تھی۔ میں نے ٹی وی کے مشاعرے دو اڑھائی پڑھے ہیں اب تک۔

"یعنی ملازم ہونے کی وجہ سے یہ پابندی تھی؟"

جی اسی وجہ سے۔ ہاں ریڈیو سے میں بہت پڑھتا تھا۔ عام مشاعرے بھی پڑھتا تھا۔ لیکن ٹیلی ویژن نے ۱۹۶۹ء میں سخنور پیش کیا۔ یوسف کامران مرحوم اس کے کمپیئر تھے تو وہ پروگرام کراچی سے اس لیے پیش نہیں ہونے دیا پیر حسام الدین راشدی کے گروپ نے کیونکہ ہم نے رائٹرز گلڈ میں ان کے خلاف الیکشن لڑا تھا اور جیتا تھا، انہوں نے یہ تحریک چلائی تھی کہ اس قادیانی کا پروگرام پیش کرنے سے شہر میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو جائے گی لہذا وہ کراچی سے پیش نہیں ہوا۔ باقی پنجاب، کوئٹہ ہر جگہ وہ دکھایا گیا۔

رائٹرز گلڈ کے الیکشن میں کامیابی

۱۹۷۴ء میں ہم نے رائٹرز گلڈ کا الیکشن جیتا اور وہ الیکشن جو تھا اس لحاظ سے بہت ہی غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا کہ قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی، ابن انشاء اور ایسے دوسرے بزرگ جو تھے وہ ہمارے مخالف کیمپ میں تھے اور اس میں سے ہمارے پینل میں سے جو تین چار آدمی جیتے اس میں سے ایک میں بھی تھا۔ پہلے میں نے مجلس عاملہ کا الیکشن لڑا اسمیں مجھے کامیابی ہوئی پھر مجلس عاملہ میں سیکرٹری کا الیکشن لڑا۔ کیونکہ ۹ ووٹ تھے اس میں ۵ ووٹ لینے تھے۔ پھر یہ ایک لمبی سیاسی کارروائی ہے کہ وہ الیکشن کیسے ہم نے جیتا۔ بہرحال میں وہ الیکشن بفضل خدا جیت گیا اور ۱۹۷۴ء میں ریجنل سیکرٹری پاکستان رائٹرز گلڈ سندھ زون بنا۔ چھ سال تک میں نے یہ عہدہ سنبھالا۔ اور رائٹرز کیلئے کیا کیا کام کیے وہ تو ایک لمبی کہانی ہے۔ بہت سے کام کیے۔ زمین کا کیس لڑا۔ رائٹرز کو ۱۵ ایکڑ زمین دلائی۔ ان کے حقوق اور مفادات کیلئے جو لڑائیاں لڑیں۔ بہت سے لوگوں کے لیے وظیفے جاری کروائے۔ پھر جناب! ۱۹۸۰ء میں دوبارہ الیکشن لڑ کر جیت گئے اور تا حال ہم مرکزی مجلس عاملہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن ہیں۔ اس وقت تک جبتک آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ٹیلی ویژن نے ۱۹۷۴ء کے پروگرام سخنور میں مجھے OUTSTANDING POET کی حیثیت سے چنا۔ چنانچہ یہ میری کیٹیگری طے ہوئی۔ اور آج تک ٹیلیویژن پر جب بھی بلایا جاتا ہے تو OUT STANDING CATAGORY میں رکھا جاتا ہے۔ اسمیں میرے خیال میں پاکستان کے سات آٹھ سے زیادہ شاعر نہیں ہوں گے۔ پچھلے دنوں میں نے ہاسنانے کی کمپیئرنگ ٹی وی پر کی تھی وہ بھی آوٹ سٹینڈنگ کیٹیگری تھی اور دوسری کتاب کا جب ۱۹۸۶ء میں افتتاح ہوا تو پھر پریس کلب میں ہوا اور اس کا جلسہ پہلی کتاب سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ تمام اختلافات کے باوجود۔ کیونکہ اب حالت بالکل ہی دوسری ہو چکی ہے۔ جولائی میں اس کا افتتاح ہوا اور اکتوبر میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا اور درمیان میں ایک ایڈیشن جعلی بھی چھپ چکا ہے۔ اور اب چوتھا ایڈیشن آنیوالا ہے۔ اور ہمارا شہر (کراچی) سال دو سال سے جس حالت میں ہے وہ آپ جانتے ہیں کہ ہر دو مہینہ کے بعد ایک مہینہ کرفیو رہتا ہے اس کے باوجود اس تازہ کتاب (ویران سرائے کا دیا) نے بھی یہ مقبولیت حاصل کی۔ جو انکی مخالفتیں میرے احمدی شاعر ہونے کی وجہ سے ہیں وہ اپنی جگہ رہیں۔

> اب فیض و فراز سے اوپر اٹھنے کا دور ہے

ایک اہم سوال

"براہ کرم اس سوال کیطرف توجہ فرمائیں کہ جماعت احمدیہ کے پیغام کو اپنے شعور اور لاشعور کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر خود کو عام دنیا میں منوا سکتا ہے اور اس ضمن میں آپ ہمارے نوجوان اور دیگر شعراء کو کیا کہنا چاہتے ہیں"

میں نے جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ یہ سوال بہت ہی بنیادی اہمیت کا سوال ہے اصل میں آپ کا یہ سوال ایک اسطرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ آج کی دنیا میں جو مجموعی طور پر اضطراب و انتشار ہے، کل دنیا میں، کسی وجہ سے بھی اضطراب ہے، اسکا حل کیا ہے؟ اور ہمارے شعراء چاہے وہ پروگریسو تحریکوں سے تعلق رکھتے ہوں یا جمالی تحریکوں سے۔ انکی آخری حد کیا ہے؟ ہمارے اس عہد کی اہم ترین آواز فیض احمد فیض کی ہے۔ فیض صاحب ایک رومانٹک لہجے کے پروگریسو شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں تمنا کا دوسرا قدم کہیں نہیں ملتا اور میں نے ایک جگہ ایک انٹرویو میں یہ بات کہی کہ فیض صاحب مادی ماورائیت کے شاعر ہیں یعنی اگر ماورائیت انکی ہے تو مادی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری اردو شاعری میں تصوف کی جو ایک گہری روایت چلی آ رہی تھی اس کا سلسلہ یکدم ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے بعد منقطع ہو گیا

اور وہ ایک طرف عوامی ہمدردی محبت یہ سب نعرے لگا رہے تھے لیکن مادے نے ان کے اندر جو تنہائی پیدا کی اس تنہائی کی اٹھان زیادہ بلند و بالا نہیں تھی۔ انسانی زندگی کی مادی مسرت یا غم جو ہے اسمیں تو وہ شریک ہو جاتے ہیں لیکن اس کے اوپر جو جست لگانے کی کیفیت تھی وہ ہماری اردو شاعری سے مفقود ہو گئی اور میں یہ نہیں کہتا کہ میرے شعوری تاثر میں یہ بات آئی ہے لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ حضرت بانی سلسلہ کے علم الکلام نے ذہن کے بہت سے ایسے گوشے کھولے کہ جہاں سے میں نے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اشعار کہے کہ شعر محض تقریر یا نظریہ نہ بنے بلکہ اسے شاعری کے لوازمات کو پورا کرتے ہوئے اپنی عصری سطح سے بلند ہو جانا چاہیئے اب اس کی مثال یہ ہے کہ ہمارے ہاں شعراء حضرات ربیع الاول کے موسم میں یا محرم کے موسم میں ٹوپیاں اور شیروانیاں پہن کر مشاعروں میں پہنچ جاتے ہیں اور اس کیفیت کو مہینے بھر کی یا دس دن کی کیفیت سمجھتے ہیں۔ وہ رات کو بیٹھتے ہیں ایک نعت لکھ لی صبح چلے گئے۔ نعت فی الواقعی ایک دن کی کیفیت نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جس شاعر کے ہاں یہ کیفیت پیدا ہو تو وہ اپنی شاعری میں ہمہ وقت اگر اس کیفیت کا اظہار کرے تو اس کی جو شعر کی عوامی کیفیت ہے یا بین الاقوامی سطح ہے اسے کیسے کامیابی سے نبھائے۔ یہ ہے سوال! میں نے اس کیفیت کو غزل میں لکھنا شروع کیا۔ نعت اور حمد اور منقبت کی کیفیت کو غزل میں لکھنا شروع کیا اور اسے مجاز سے اتنا ہم آہنگ کر دیا کہ بیک وقت ۱۸ سالہ لڑکا یا ۸۰ سالہ بزرگ اپنے محبوب کو سنا سکتا ہے۔ یعنی مجاز اور حقیقت کا جو فاصلہ تھا اسے علم الکلام نے بھر دیا۔

"آپ کے خیال میں حقیقی شاعر کا کیا پیرایۂ اظہار ہونا چاہیئے؟"

شاعرانہ پیرایۂ اظہار

پیرایۂ اظہار کو کبھی بھی کوئی شاعر فکس نہیں کر سکتا کہ جی یہی ہوگا تو بس ہوگا نہیں تو نہیں ہوگا۔ مگر ایک بات میں عرض کر دیتا ہوں کہ فرض کیجئے کہ مثال کے طور پر میں ایک مجلس عرفان میں بیٹھا ہوا تھا تو میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کو دیکھ رہا تھا میں نے دعا کی اللہ تعالیٰ اس آدمی کی محبت نہیں ڈال سکتا میرے سینہ میں؟ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مادی محبت ہوتی ہے اسمیں عجیب سی طبعی کیفیت اور جوش ہوتا ہے۔ اس میں جذباتی سا انداز ہوتا ہے تو ایک آدھ دن کے بعد سلسلہ شعر شروع ہو گیا۔ تو اسمیں جو شعر میں نے لکھے وہ اگر آپ یہاں سنیں تو میری بات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ کہ بظاہر اگر آپ وہاں سے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی شخصیت کو نکال لیں اور اسے آپ ایک محبوب کی محبت میں بدل لیں اور اگر اس سمت میں نہیں آنا چاہتے تو آپ کسی بزرگ کی محبت میں بدل دیں اور جتنے بھی ارفع مقامات کی طرف آپ جانا چاہتے ہیں وہاں چلے جائیں اور مجاز میں رہنا چاہتے ہیں تو مجاز میں رہیں۔ تو سوائے ایک آدھ دو شعروں کے جو شخصیت کو واضح کرتے ہیں باقی آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ یہ تو رومانوی رویہ ہے۔ جبکہ وہ رومانی رویہ نہیں بلکہ روحانی ماورائیت کا رویہ ہے، وہ اشعار میں عرض کرتا ہوں۔ خاص طور پر میں نے اس غزل کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ یہ ایک خاص واقعہ سے لکھی ہے میں نے۔ پہلا مصرعہ یہ ہے

> شاعرانہ لوازمات کو فراموش کر دیں تو بڑی سے بڑی بات گھٹیا نظر آئے گی

دل کی پاتال سرا سے آئی
دولتِ درد دعا سے آئی

اور اب یہ شعر سنیئے:

ایسا لگتا ہے کہ اس کی صورت
عالمِ خواب نما سے آئی
چلتے ہیں نقشِ قدم پر اس کے
جس کو رفتارِ صبا سے آئی
یونہی قامت وہ قیامت نہ ہوا
ہر ادا ایک ادا سے آئی
حُسن اس کا تھا قیامت اس پر
وہ قیامت جو حیا سے آئی

ہر صدا آئی پہ اس کی آواز
صرف تسلیم و رضا سے آئی
دل وہ آنسو کہ پلک سے ٹپکا
غم وہ بارش کہ گھٹا سے آئی
اب کہ پامال زمینوں پہ بہار
اور ہی آب و ہوا سے آئی
جان بیمار میں اس کے آخر
اس کے ہی دستِ شفا سے آئی

ہم میں اک اور بقا کی صورت
ہم پہ اک اور فنا سے آئی
ہم نے ہر شئے کو الگ سے دیکھا
ہم میں یہ بات خدا سے آئی
چاک کرتے تھے گریباں اپنا
روشنی بندِ قبا سے آئی

دیکھئے بندِ قبا کا لفظ میں نے یہاں لکھ دیا ہے۔ اب بندِ قبا کے لفظ کو روحانی اصطلاح میں استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس لفظ کو روحانی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا لیکن میں نے خالص روحانی طور پر استعمال کیا۔ یہ تو میں یہ بتا رہا ہوں کہ بظاہر اس غزل کا ماحول اور لگتا ہے اور اس غزل کو میں نے مجاز کے معنوں میں ہر محفل میں سنایا ہے۔ میں آگے چلتا ہوں

ہے یہ ایمان کہ اسکی آواز
سلسلہ وار خدا سے آئی

اس سے اس بات کو طے کر لیجئے کہ آپ اس بات کو سمجھ رہے ہیں۔ لیکن اگر میں اس بات کو عام مجلس میں سناؤں گا تو اس سے جہاں سے سامع کا روحانی میدان کی طرف ارتفاع ہوگا وہاں اس کے اندر مجازی کیفیتیں بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ میں یہ بات عرض کر رہا ہوں۔ اب اگر اس بات کو یونہی لکھ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قدرتِ ثانیہ کا چوتھا مظہر بنایا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی یہ یہ بشارتیں ہیں۔ اس بات کو میں نے لکھا تو یوں لکھا کہ

دل کی پاتال سے اسے آئی
دولتِ درد دعا سے آئی

تو اب یہ بات ہے کہ میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے بارے میں اشعار لکھے وہ میری کتابوں میں شامل ہیں اور میں نے مشاعروں میں پڑھے اور میں نے کہا کہ میں نے ایک بزرگ کی وفات پر شعر لکھے ہیں۔ اب ان اشعار کو لوگ پڑھ رہے ہیں۔ یعنی مراد یہ ہے کہ آپ کی کوئی کیفیت انسان کے بین الاقوامی جذبے کے کیسے قریب پہنچ سکتی ہے اور شعری لب ولہجے میں کیسے بیان ہو سکتی ہے جس سے سننے والے کو اندازہ ہو جائے کہ یہ ایک حقیقت ہے۔

احمدی شعراء سے گزارش

میں اپنے احمدی شعراء حضرات سے درخواست گزار ہوں کہ بھئی آپ کے جذبے تو صادق و مسلم ہیں ان میں کسی شئے کی ضرورت نہیں لیکن آپ کا خطاب ان لوگوں سے بھی ہونا چاہیئے جو آپ کے ہم نظریہ نہیں ہیں اور آپ کے جذبات ان کو پہنچانے کا کوئی ذریعہ ہونا چاہیئے اور زبان ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ فیض صاحب ترقی پسند تھے لیکن انہیں رجعت پسند بھی پسند کرتے تھے کہ ظلم کے خلاف ایک بات ہے انہوں نے ایک خاص لباس میں وہ بات کہی ہے اور جو بھی مظلوم آدمی ہے وہ انکی شاعری پسند کریگا اور جو بھی انسان سے محبت کرنا چاہتا ہے وہ فیض سے محبت کرے گا۔ لیکن اگر ہم اپنے نکتہ نظر کو بعض الفاظ کے استعمال سے دُبلا پتلا کر دیں تو یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم دنیا کی آخری جماعت ہیں اور یہی کلام آنیوالے زمانے میں کلام ٹھہریگا لیکن تمام اردو دنیا کی شاعری کی صنف کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلیگا کہ شاعرانہ محاکات بہت ضروری ہیں۔ اس کی بلاغت اور فصاحت بہت ضروری ہے۔ یعنی شعر کو پہلے شعر ہونا چاہیئے اس کے لوازمات طے کرتے چاہئیں اس کے بعد کسی بھی نقطۂ نظر کی بحث اسمیں ہو سکتی ہے لیکن اگر پہلے شعر شعر نہیں ہے تو اسمیں جو بھی نظریہ بیان ہوگا وہ گھٹیا بات شمار ہوگی۔ اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ اس بات کی تو ہمیشہ اجازت ہونی چاہیئے کہ ہم بالکل بیانیہ انداز میں کبھی کبھار بات کریں وہ ہماری زندگی کی صحافیانہ طرز ہے اور ہماری ضرورت ہے اور دنیا کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ روزمرہ کے واقعات کو ہم منظوم صورت میں بیان کر دیں۔ لیکن اگر ہم یہ پڑھیں کہ:

بعد از خدا بعشق محمدؐ مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

تو جہاں بھی نعت پڑھی جا رہی ہو وہاں یہ سنایا جا سکتا ہے۔ اور ایسے ہی حضرت بانی سلسلہ کے بے شمار اشعار، حضرت فضلِ عمر کے بے شمار اشعار، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ حضرت مصلح موعود کی بعض نظمیں اگر میں سناؤں اور مخاطب کو نہ بتاؤں تو ممکن ہے کہ وہ ان اشعار کو اختر شیرانی کے اشعار سمجھے۔ مثلاً وہ نظم

میں تمہیں جانے نہ دوں گا
میں تمہیں جانے نہ دوں گا
چاہے تم کتنا ہی رو کو چاہے تم ....

وہ کیا لب ولہجہ ہے؟ اور اسمیں ہے کون؟ یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا عورت کی زبان میں یاد آ رہا ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا

ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے ہمیں شعر کہنے کے بڑے زبردست راستے بھی سمجھائے ہیں کہ دیکھئے ان کے سامنے جو مخاطب تھے ۔ یعنی یہ کہ حضرت بانی سلسلہ نے حافظ کا کلام پڑھا ان کے اشعار ملتے ہیں، مولانا روم کے سعدی کے اشعار ملتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ محاکات شعری استعمال ہوتے ہیں اور حضرت بانی سلسلہ کی اس روایت کی اثر پذیری حضرت فضلِ عمر تک آئی ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت مصلح موعود کا کلام از کم ۳۰، ۴۰ فیصد کلام ایسا ہے جو کسی بھی غیر محفل میں آسانی سے سنایا جا سکتا ہے اور ہمارے احمدی شعراء کو، 'میں تو کیا ہوں' میں تو بہت ہی حقیر سی چیز ہوں اس طرف دیکھنے کی طرف جانا چاہیئے ۔ آج کے شاعر کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ مثلاً وہ دیکھے کہ فیض کا کلام کیا ہے، فراز کا طرزِ کلام کیا ہے ۔ اور وہ کس طرز کلام میں اپنی بات کہہ سکتا ہے اور دشمن کی محفل میں بیٹھ کر کہہ سکتا ہے "ظالم کی محفل میں بیٹھ کر یہ کہے گا کہ تم نے مجھ پر ظلم کیا ۔ وہ اپنے ظلم کو اپنے ہی لوگوں کو سنا رہا ہے ۔ مثلاً دیکھئے میں آپ کو چند اشعار سناتا ہوں اور اس قدر لوگوں نے سنا ہے ۔ یہاں تک کہ ہمارے وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب صاحب وہ الوزمغفود کو وہاں لندن میں ملے انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کے کیا حالات ہیں ؟ یہ کوئی ۴/۵ سال کی بات ہے ۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ایک شعر سنا دیتا ہوں ۔ جس سے آپکو ہمارے ملک کا اضطراب اور مذہبی صورت حال سمجھ میں آجائے گی ۔ انہوں نے سنایا کہ :

اس قافلے نے دیکھ لیا کربلا کا دن
اب رہ گیا ہے شام کا بازار دیکھنا

اسمیں غصے کی شدت ہے جو بیان ہوئی ہے اور اسمیں یہ شعر بھی لکھا کہ :

میں نے سنا ہے قرب قیامت کا ہے نشاں
بے قامتی پہ جبہ و دستار دیکھنا

دیکھئے اس مجلس کے لوگ یہ جان کر کہ میں احمدی ہوں اگر یہ شعر سنتے کہ "میں نے سنا ہے قرب قیامت کا ہے نشاں"، تو وہ مجھ سے کہہ سکتے تھے کہ یہ کیا بکواس کر رہے ہیں آپ لیکن شعری روایت کے تسلسل میں میں نے یہ بات بھی ان کو کہہ دی ہے اور پچھلے دنوں یہ سنایا کہ :

آج کی ہے جو کربلا، کرتے ہیں اسکا فیصلہ
آج ہی آپ نے اگر جشن منا لیا تو کیا
اور
اب کہیں بولتا نہیں غیب جو کھولتا نہیں
ایسا کوئی اگر خدا تم نے بنا لیا تو کیا

یہ غزل میں نے اپنی کتاب کے افتتاح کے وقت پڑھ کر سنائی تھی ۔

احمدی شاعر کی طاقتِ گفتار

تو اب سوال یہ ہے کہ سننے والا تو سمجھ رہا ہے کہ مجھ پر جو مار پڑی ہے میں اس کے جواب میں مار لگا رہا ہوں لیکن شعری محاکات سے نہیں ہٹا ۔ یہ بات میری عرض ہے اور گزارش ہے کیونکہ طاقت تو احمدی شاعر کے سوا کسی میں نہیں طاقتِ گفتار کوئی کہاں سے لائے گا ۔ وہ علم الکلام کہاں سے لائے گا ۔ قوت کہاں سے لائے گا ۔ یہ بات تو طے ہے ۔ اب سوائے اسکے کہ اس کے پاس اظہار کی جو قوت آنی چاہیئے وہ اظہار کے وسیلے اس کے پاس ہوں تو اسکی بات کی قوت ظاہر ہو سکے گی ورنہ نہیں ہوگی ۔ اس ضمن میں ایک اور بات کہ ہمارے جو رسائل ہیں ان میں مجھے ایک ایک حرف پڑھنے کی سعادت نصیب ہوتی رہتی ہے ۔ سارے رسائل جتنے بھی یہاں سے چھپتے ہیں ۔ بار بار یہ بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے ان کے جذبے کی قوت اور سچائی سے انکار نہیں لیکن میں یہ بات ضرور عرض کر دوں گا کہ مثلاً حضور کے اشعار پڑھے اور سنے وہ جو یہ ہے کہ :

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے اس شعر کو ماڈل بنائیں

بس یادِ دوست اور نہ کر فرشِ دل پہ رقص ٭ سن کتنی تیرے پاؤں کی جھانجن اداس ہے

میں آج کے شعراء کو پیغام دینے کی سطح پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اس شعر کو ماڈل بنائیں دیکھئے جھانجن کا لفظ استعمال کیا ہے ۔

بس یادِ دوست اور نہ کر فرشِ دل پہ رقص

"نذرِ دل"، "رقص" اور "یادِ دوست" کے پاؤں کی جھانجن اداس ہے۔ یہ ہے شاعری اور اس میں ملال بھی کتنا زبردست ہے۔ کتنی شدت ہے اس میں۔ اب کیا ہوا کہ غزل تو حضور نے اپنی شدتِ غم میں لکھی اور اس کا ایک شعر اور ہے کہ:

آنکھوں سے جو لگی ہے جھڑی تھم نہیں رہی
آ کر ٹھہر گیا ہے جو ساون اداس ہے

اگر آپ اس غزل کے اشعار کو پڑھیں تو آپ کو باہر جانے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور باقی ہمارے شعراء نے حضور کی اور زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں تو میرا خیال ہے کہ جب تک کوئی اور قوت پیدا نہ ہو اس پر کام نہیں کرنا چاہیئے۔ حدِ ادب میرے خیال میں چاہیئے تھی۔ جہاں تک اس بات کا غم ہے کہ حضور یہاں تشریف نہیں رکھتے یہ تو ہے ہی۔ پھر اسمیں حضور کا پیرایۂ اظہار دیکھیں۔ ابھی ایک تازہ زمین آئی ہے

.....سلام کہنا کے بعد

آئے وہ دن کہ ہم جن کی چاہت میں گنتے تھے دن اپنی تسکینِ جاں کیلئے
پھر وہ چہرے ہویدا ہوئے جن کی یادیں قیامت تھیں قلبِ تپاں کیلئے

اب بتایئے یہ کیا لب و لہجہ ہے؟ یہ ساری غزلیں میں پڑھ دیتا ہوں ہر کوئی سنے گا۔ چلیئے اس میں دو چار شعر خاص جماعتی خطاب کے ہیں اس کے سوا باقی اشعار تو خالص شاعری ہے

احمدی شاعر کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے

"اچھا یہ بتائیں اس کا عملی لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے کس طریق سے ہم شعری محاکات کا صحیح ادراک حاصل کر سکتے ہیں؟"

میرا خیال ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو ایک خوف لاحق ہے کہ اگر انہوں نے اپنے طرزِ سخن کو اس رویئے کے علاوہ استعمال کیا تو ان کے اشاعت کے ذرائع ختم ہو جائیں گے:

"اچھا یہ وجہ ہے آپ کے خیال میں"

جی ہاں! اور انکی جو مخفی صلاحیتیں ہیں وہ بہت طاقتور ہیں لیکن ان کو اظہار کا رستہ نہیں مل رہا۔ خالد میں جو نئی آوازیں ہیں اٹھارہ انیس سال کی انکو جگہ دینی چاہیئے، کہیں گنجائش نکالنی چاہیئے۔ ایک شعبۂ ادب کے نام سے انہیں چھاپنا چاہیئے اور ہمارے ہاں مثلاً بعض ادبی تحریکوں پر کام ہونا چاہیئے کہ ادبی روایات پر جو کام ہوا ہے میرؔ غالبؔ وغیرہ اس پر ہمارے ہاں کبھی مضامین نہیں چھپے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ مثلاً میرؔ ایک شاعر تھا، سوداؔ تھے، مومنؔ تھے یہ کون لوگ تھے کیا بات کہتے تھے کیسے کہتے تھے۔ جبتک کہ یا تو آپ کی مجالس میں اس پر گفتگو ہو اور آپ کے پرچوں میں جب تک ان ادبی موضوعات کی گنجائش نہیں ہوگی تو یہ ہوگا کہ نئی نسل کی تربیت کے جو شعری مسائل ہیں ان کو آپ ایک روٹین ورک میں جا کر ضائع کرتے رہیں گے۔ ایک تکراری عمل میں تو شاعری ہوتی رہے گی لیکن کوئی نئے لب و لہجہ کا شاعر پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اتنے سارے ادبی رویّے ہیں۔ میرؔ کا رویّہ، غالبؔ کا، مومنؔ ہیں۔ اب تازہ شعراء ہیں۔ ان پر بھی کچھ شائع ہو۔ ہاں "لاہور" رسالے میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہمارے رسالوں میں میرؔ پر غالبؔ پر فانیؔ پر جگرؔ پر یا اور کسی پر کوئی مضمون چھپا ہو۔ کیا وجہ ہے اس کی آخر؟ آج بھی جب آپ حضرت بانیٔ سلسلہ کے قصیدے کی تشریح کر رہے ہوں گے تو آپ کو متنبی اور امراؤ القیس کا ذکر کرنا پڑے گا۔ تو آپ جو آج کے دور کے متنبی اور امراؤ القیس موجود ہیں انکا ذکر کیوں نہیں کرتے؟ یعنی حضرت مسیح موعود کے زمانے کے بھی تو امراؤ القیس ہیں یعنی غالبؔ میرے خیال میں حضرت مسیح موعود کے زمانے کا امراؤ القیس ہے۔

شاعرانہ لب و لہجہ اختیار کریں

دیکھیں ہمارے حضرت مرزا طاہر احمد صاحب امام جماعت احمدیہ غالب کے کیسے کیسے شعر پڑھتے ہیں اور اس کی کیسی کیسی تشریحات کرتے ہیں۔ اس بات سے جماعت کو سیکھنا چاہیئے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع غالبؔ کے کیوں شعر پڑھتے ہیں۔ فیضؔ کا شعر بھی ایک دن پڑھ دیا تھا حضور نے:

"جی ہاں! فیض کی غزل کے چار پانچ اشعار پڑھے تھے"

تو اس سے زیادہ اور کیا پیغام دیں گے خلیفۃ المسیح الرابع شاعروں کو۔

"ایک بار جالب کا شعر بھی پڑھا تھا"

تو خلیفۃ المسیح الرابع کا یہ انداز ملاحظہ کریں۔ یعنی میں اس بات کو اپنے کہنے کی بجائے یہ بات کہتا ہوں کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع دراصل جماعت کو اور شعراء کو یہ بات سمجھانا چاہتے ہیں کہ بھائی نئے انداز سے نئے ڈکشن سے بات کرو۔ نئے پہلو نکالو بات کرنے کے۔ اب دیکھیئے ایک تفسیری متن جو ہے خود حضور خلیفۃ المسیح الرابع کا اس کا ڈکشن ہی بالکل دوسرا ہے۔ میں ایک بات آپ سے عرض کروں کہ میں یہ بات اسلیئے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے حکم دیا شعر سنانے کا تو میں بڑی سوچ میں پڑ گیا کہ اس آدمی کو کیا شعر سناؤں؟ یا تو نعت کے شعر سناؤں یا حمد کے سناؤں باقی شعر اگر میں نے سنائے تو کہے گا کیا یہ آدمی؟ کہ تم کیا کر رہے ہو؟ لیکن جب میں نے یہ شعر سنایا:

کچھ عشق تھا کچھ مجبوری تھی سو میں نے جیون وار دیا
میں کیسا زندہ آدمی تھا اک شخص نے مجھ کو مار دیا

تو حضور نے جس محبت و شفقت سے وہ شعر سنے تو مجھے بھی میرے اس سوال کا جواب مل گیا کہ جو کام میں نے فطری طور پہ کئے بیٹھے کیا وہ بالکل ٹھیک تھے؟ اور نہ صرف حضور نے یہ اشعار سُنے بلکہ ایک بار پھر فرمائش کر کے فرمایا کہ وہ غزل سناؤ۔ اسکے بعد میں نے سنایا

باہر کا دھن آتا جاتا اصل خزانہ گھر میں ہے
ہر دھوپ میں جو مجھے سایہ دے وہ سچا سایہ گھر میں ہے

میں نے اسمیں یہ شعر بھی سنایا۔

کیا سوانگ بھرے روٹی کیلئے عزت کیلئے شہرت کے لیے
سنو شام ہوئی اب گھر کو چلو اک شخص اکیلا گھر میں ہے

اچھا میں آپ سے یہ بھی عرض کر دوں کہ اردو شاعری میں بیوی کو محبوبہ بنانے کا کوئی رواج نہیں۔

" آپ بجا فرماتے ہیں یہ بات میں نے ایک بار خود ایک جگہ بیان کی کہ واحد شاعر میں نے عبیداللہ علیم کو دیکھا ہے جس نے بیوی کو اپنے شعروں میں باندھا ہے۔ ورنہ یہ بات تو بد اخلاقی شمار ہوتی ہے شاعروں میں! کہ بیوی کو محبوبہ کے برابر کر دیا"

تو ایک بات تو یہ بھی کہ اس روایت کو میں نے بدلا۔ اور بچوں کو میں نے باندھا شعر میں۔

میرے بچوں کو اللہ رکھے ان تازہ ہوا کے جھونکوں نے
میں خشک پیڑ خزاں کا تھا مجھے کیسا برگ و بار دیا

یہ خیال مجھے کہاں سے پیدا ہوتا اگر میرے لاشعور میں یہ بات نہ ہوتی کہ حضرت بانی سلسلہ نے پوری نظم لکھی ہے بچوں کے بارے میں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے پاس خزانے موجود ہیں اور اس صدی کی بڑی شاعری صرف احمدی کر سکیں گے دوسرے کے بس کی بات نہیں یعنی میں اس بات کو کھل کر بالکل صاف کہنا چاہتا ہوں جتنی بھی کوئی مخالفت کرنا چاہے بیشک کرے کہ یہ صدی احمدیوں کی صدی ہے اور احمدی شعراء کے اندر جتنی قوتیں موجود ہیں جتنا والہانہ پن موجود ہے جتنا اثر موجود ہے دوسرے آدمی کے تجربے میں بھی نہیں آسکتا لہٰذا اس کے لیے آپ کوئی ایسا گوشہ متعین کریں کہ جہاں نوجوانوں سے کہا جائے کہ لکھیں! آزاد ہو کے لکھیں اور دوسری مجالس میں جا کے شعر سنائیں اور اسکے لیے کوئی کمپلیکس نہ پیدا کریں احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔

" ہم عصر شعراء کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"

آپ یقین جانیں کہ میں پچھلے ۲۰ سالوں سے کسی چیز کو گھاس نہیں ڈال رہا۔ ہم عصر شعراء میں فیض صاحب بھی شامل ہیں فراز بھی ہیں۔ میں جشن فراز میں ابوظہبی گیا تھا میں نے کہا کہ بھیا! ان لوگوں کی باتیں تو اب گزر چکیں اب تو تمہیں ذرا اور اوپر اٹھنا چاہیئے۔ اسلیئے کہ میں ان سے کسی بھی طرح سے احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوں کہ وہاں جو ایک گروہ ان کے ساتھ کھڑا ہو کر آٹوگراف لے رہا ہے تو میں اس سے محروم ہوں۔ میرے ساتھ بھی ایک گروہ کھڑا ہوا ہے وہاں ساتھ ہی۔ اور اس نظریے کیساتھ کہ میں احمدی ہوں۔ کیونکہ مجھ سے زیادہ مظلوم اس صدی میں اور کوئی نہیں ہے۔ تو مظلوم اگر اپنی آواز تراشش نہیں پاتا تو اور پھر کون سا وقت آئے گا شعر کہنے کا! مظلوم کی آواز تو اتنی شدید اور اثر انگیز ہوتی ہے کہ وہ نئی نئی زبانیں تراشش کے لے کر آتا ہے۔

احمدی شعراء کا ذکر

" اس ضمن میں کیا آپ احمدی شعراء کے بارے میں بھی کچھ ذکر کرنا پسند فرمائیں گے "

میں نے آج ایک کتاب خریدی روح القدس کے موسیقار اور مجھے اس کتاب کو خریدنے سے ایک مسرت ہوئی اور ایک ملال ہوا۔ ملال مجھے یہ ہوا کہ میری دو چیزیں اسمیں چھپی ہیں اور وہ میرے حافظے میں بھی نہیں ہیں اور یہ انکی محبت تھی کہ نجانے انہوں نے کہاں سے وہ تلاش کیں۔ بہر حال ہیں وہ میری۔ ان میں سے ایک تو میری ہے لیکن دوسری کے بارے میں مجھے قطعاً ذہن میں نہیں آتا کہ وہ میری ہے یا نہیں؟ اور ۱۹۷۸ء میں وہ کتاب چھپی ہے اور ۱۹۷۴ء میں میرا پہلا مجموعہ کلام " چاند چہرہ ستارہ آنکھیں " چھپ گیا تھا۔ منتخب کرنیوالے جو دوست ہیں انکو کم از کم اتنا ضرور معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ یہ شاعر ہے جو بھی ہے تو اس کے مجموعے میں سے انتخاب کر لیں۔

" جی ہاں! چوٹی کی چیزیں آنی چاہئیں "

کوئی اس سے بہتر چیز نکال لیں۔ ٹھیک ہے آدمی کلام تو لکھتا ہے۔ لیکن انتخاب بہر حال ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح سے میں نے اور کلام دیکھا اور آج ہی میں نے اس کتاب کو شروع سے لے کر آخیر تک دیکھ بھی لیا۔ آج ہی لایا تھا۔ آج ہی ختم بھی کر لی۔ مجھے ایک زمانے میں جناب عبدالسلام اختر صاحب کا کلام بہت پسند تھا۔ ان کے اندر ایک اور قسم کی اپروچ تھی اور ہمارے راجیکی صاحب جو تھے، مصلح الدین راجیکی ان کا کلام پسند رہا۔ اور اسی طرح مجھے بعض اشعار بشیر راجیکی صاحب کے بھی پسند آئے کہ لگتا تھا کہ ان کو حقیقی شاعری پر قدرت کلام حاصل ہے

جماعت کے نوجوانوں کو چوہدری محمد علی کے بارے میں بتائیں

ہمارے بزرگ شاعروں میں جو مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں وہ محمد علی صاحب یعنی پروفیسر محمد علی صاحب (سابق پرنسپل تعلیم الاسلام کالج) ہیں۔ اب دیکھیں یہ بوڑھے آدمی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ۷۳/۷۴ سال انکی عمر ہے۔ اور اتنے فریش FRESH لب ولہجے میں وہ شعر لکھتے ہیں۔ اتنا تازہ گو آدمی ہے کہ جماعت کے نوجوانوں کو ان کے بارے میں بتائیں انکی صحبت میں لے جا کر بٹھائیں کہ دیکھو یہ حقیقی شاعر ہیں کیسی بات کہتے ہیں اور انکی شاعری کا ۷۰ فیصد حصہ جو ہے، جب بھی ان کا کلام چھپا تو وہ ایک بہت اہم شاعر کے طور پر گردانے جائیں گے۔ ان کو میں بہت ہی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اور خواتین شاعرات میں مجھے صرف ایک شاعرہ جو ہیں وہ اپیل کرتی ہیں۔ امۃ القدوس صاحبہ۔ انکی قوتِ شاعری ایسی ہے جو دل کو لگتی ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے دنوں میں نے دو چیزیں پڑھیں خالد میں۔ میں اس کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے حضور کو دیکھنے سے پہلے اور حضور کو دیکھنے کے بعد کے جذبات کا ذکر کیا۔ ان کا نام کیا ہے؟

" ان کا نام طاہر عارف ہے "

جی وہی؛ اب لکھنے والے نے صرف دو چیزیں لکھی ہیں اور ان صرف دو چیزوں سے وہ مجھ سے متعارف ہو گیا۔ صرف دو چیزیں ان کی میں نے پڑھیں۔ اب جب بھی ان صاحب کا نام آئے گا میں وہاں کھڑا ہو جاؤں گا اور ان صاحب کا شعر ضرور سنوں گا اور پھر آگے بڑھوں گا تو وہ رویّہ جو ہے وہ مجھے بہت ہی محبوبانہ لگا۔ ان کا طرزِ کلام بہت رچا بسا لگا۔

" کل جب آپ سے گفتگو ہو رہی تھی تو آپ نے ڈاکٹر فہمیدہ صاحبہ کا بھی ذکر کیا تھا "

جی ہاں! میں سمجھا تھا کہ ڈاکٹر فہمیدہ کوئی بہت نو عمر خاتون ہوں گی۔ ان کے جذبات سے میں یہ محسوس کرتا تھا۔ لیکن آج مجھے احساس ہوا کہ میرا خیال درست نہ تھا۔ ان کے پاس جذبے کی جو فراوانی ہے وہ مجھے بہت پسند آتی ہے۔ ایک دم والہانہ اور تیز جذبہ ہے کراچی سے ہماری ایک خاتون امۃ الباری ناصر صاحبہ لکھتی ہیں کبھی کبھار ان کے اشعار بھی متاثر کرتے ہیں لیکن یہ ہے کہ امۃ القدوس صاحبہ کے بارے میں لگتا ہے کہ جیسے انہوں نے بغور حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ شاعری میں اظہار کی قدریں کیسے بروئے کار آنی چاہئیں۔ اور لگتا ہے کہ انہیں لفظ کو برتنے اور سمجھنے کا ایک سلیقہ ہے۔ مثلاً میں نے ان کو پڑھا۔ مجھے انکے بہت سے اشعار اچھے لگے۔ مبارک احمد عابد صاحب اور ایک پرویز پروازی صاحب ہیں۔ بلاشبہ جہاں تک قدرتِ کلام کا تعلق ہے وہ انہیں خوب حاصل ہے۔ احمدی شعراء میں آپ نے ایک صاحب صابر ظفر صاحب کا نام بھی سنا ہوگا

" جی ہاں! اتفاق سے وہ ہمارے رسالوں میں متعارف نہیں ہیں "

ان کا ابتدائی تعارف تو لاہور سے ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "ابتداء" لاہور ہی سے چھپا تھا لیکن دوسرا مجموعہ "دھواں اور پھول" کا پیش لفظ میں نے لکھا۔ اور ان کے لیے دعا کریں۔ وہ باقاعدہ احمدی شاعر ہیں۔ احمدی کی حیثیت سے ہی پہچانے جاتے ہیں اور بہت مضبوط اور طاقتور شاعر ہیں۔ اور میں نے ایک کلام کا حصہ پڑھا۔ اسلام آباد میں وہ دوست رہتے ہیں۔ وہیں پڑھاتے ہیں استاد ہیں۔ اکبر حمیدی صاحب۔ انکی شاعری میں وہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں وہ پائی جاتی ہے۔ اور ہمارے ایک دوست ملتان میں تھے۔ ہماری ان سے ایک بار ملاقات بھی ہوئی ان کی ایک نظم تھی

قضا ہوگیا وہ شخص۔ دعا ہوگیا وہ شخص ......

وہ رشید قیصرانی صاحب ہیں۔

احمدی شاعروں کا گروہ

یہ احمدی شعراء کا وہ گروہ ہے۔ جو باہر متعارف ہیں تو ممکن ہے کہ ہم خود احمدی شعراء سے متعارف نہ ہوں یا احمدی شعراء ہمیں جانتے نہ ہوں لیکن باہر کی جو دنیا ہے وہ ہمیں احمدی شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ہمارے ایک بزرگ کا نام میں اسوقت دعا کی غرض سے لینا چاہتا ہوں اور وہ تھے پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان مرحوم۔ جب میں آیا کرتا تھا تو وہ مجھے گھر بلایا کرتے تھے۔ شعر سنا کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بڑی رنگینی تھی۔ انکی شاعری بھی بھلی لگی مجھے اور اپنی وفات سے چند دن پہلے انہوں نے مجھے اپنی کتاب بھی بھجوائی۔ اور کوئی نام اگر میرے ذہن میں نہیں آرہا تو وہ مجھ سے خفا نہ ہوں کہ کوئی نام ذہن سے اتر بھی سکتا ہے

حضرت مصلح موعود کے خط نے میرے شعری قوٰی کی کایا پلٹ دی

ہمارے شفیع اشرف صاحب ہیں جنہوں نے ہمیں شاعر بنایا۔ ابھی پچھلے دنوں ان کی ایک غزل میں نے پڑھی مسلسل غزل تھی۔

ہم تیرے آستاں سے ہو آئے

کمال چیز تھی وہ۔ بہت خوب لکھی انہوں نے۔ بہت خوب۔ قیس مینائی صاحب ہمارے شہر کے ہیں۔ لیکن ان سے بہت کم ملاقات ہوتی ہے وہ ہماری پہلی تقریب میں بھی شامل ہوئے۔ قطعات بھی انہوں نے پڑھے بڑی محبت سے اور بس ایک استاد شاعر کا رویہ ہے ان کا مستحکم کلام لکھتے ہیں۔ شاعری بات یہ ہونی چاہیئے کہ اگر اس کے کلام سے اس کا نام ہٹا دیا جائے تو پتہ چل جائے کہ یہ فلاں شاعر کا شعر ہے۔ ہمارے منفرد لب ولہجے کے جو لوگ ہیں وہ اس قدر نہیں جسقدر ہونے چاہئیں اگر ہیں تو کہیں پوشیدہ ہوں گے۔

جہاں تک احمدی شعراء سے بطور احمدی تعصب برتے جانے کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ ہے لیکن کوئی شخص اس شعر کو کیسے جھٹلائے گا جو اسے ایک دفعہ پسند آئے گا۔ اب ۱۹۶۵ء میں جب لوگ قومی نغمے لکھ رہے تھے میں نے ایک غزل لکھی۔

خیال و خواب ہوئی ہیں محبتیں کیسی
لہو میں ناچ رہی ہیں یہ وحشتیں کیسی
ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

احمدی شعراء اپنے حلقے سے باہر بھی نکلیں

احمدی شعراء کی خدمت میں ایک بات یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس جس علمی حلقے میں تعصبات کی فضا کے باوجود ہمارے لیے کوئی پذیرائی ہے جن کی باتوں کا کوئی رخ ہمیں قابل قبول ہے ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی جگہ سے نکل کر ان سے بھی ملیں اور انکی باتیں بھی سنیں۔ جیسے کہ میں بتا چکا ہوں کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اور رالح کی شاعری سے ان اصولوں کو اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ فیض اور غالب وغیرہ کے اشعار پڑھتے ہیں اس کی تشریح کرتے ہیں تو اس سے احمدی شعراء کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ خطاب اسے ہے۔ اور اب جس غالب نے پیدا ہونا ہے حضرت مسیح موعود کی بعثت کے بعد وہ غالب احمدی شعراء میں سے ہی کوئی ہوگا۔ وہ میر اب احمدی شعراء میں سے ہی اب پیدا ہوگا۔ اور وہ مومن اب احمدی شعراء میں سے ہی پیدا ہوگا۔ باہر کی فضا میں اب یہ امکانات رہے ہی نہیں اسلیئے کہ وہ مصنوعی اور ہیئت کی فضا بن چکی ہے۔ باہر کے شاعر صرف ہیئت کو اختیار کرتے ہیں کہ ہم نے نثری نظم لکھنی ہے، ہم نے آزاد نظم لکھنی ہے۔ ہم نے فلاں کام کرنا ہے۔ انکا مواد CONTENT ختم ہو چکا ہے

اور ہمارے اندر تو مواد بہت ہے۔

"بڑی پرلطف باتیں ہیں آپ کی۔ ہماری سوچ کی کئی نئی کھڑکیاں اور کئی نئے دروازے کھلے اور امید ہے کہ اس انٹرویو سے ایک نئی سوچ جنم لے گی"

بس میری درخواست یہ ہے کہ گفتگو میں اگر کہیں حدِ ادب سے میں نکل گیا ہوں تو ان الفاظ کو بغیر کسی رو رعایت کے قلمزد کر دیجئے میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے بزرگ شفقت بھی بہت کرتے ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کو میں نے کلام سنایا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کو تو میں نے بہت کلام سنایا۔ یعنی میں حضور کو خاصی دیر تک اشعار سناتا رہا اور آپ نے خود کیسٹ پر ریکارڈ کیا اور میں نے ہر قسم کے اشعار سنائے۔ کوئی یعنی یہ بات نہیں تھی کہ مجھے یہ کہتے کہ یہ کیا طرزِ سخن تم نے اختیار کی۔ مجھے "ویران سرائے کا دیا" پر بہت داد دی۔

بعض احمدی شعراء دور کیوں چلے جاتے ہیں" ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمارے احمدی نوجوان شعر و سخن کی وادی میں قدم رکھتے ہیں تو ان میں سے بعض آہستہ آہستہ احمدیت سے دور جانا شروع ہو جاتے ہیں اور چند ایسے ہیں جو صحیح رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ایک تو ہمارے احمدی شعراء کے بارے میں منفی فضا پیدا ہو جاتی ہے دوسرا یہ نقصان ہوتا ہے کہ نئے لوگ آنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے اور اس کا حل کیا ہے"

یہ بہت ہی بنیادی اور اہم بات ہے۔ میں آپ سے یہ عرض کر دوں کہ اگر کوئی چیز گھر میں نصیب ہو جائے تو آدمی باہر نہیں جاتا پہلے تو اس بات کا تجزیہ کرنا چاہیئے کہ وہ کون سے نفسیاتی اسباب ہیں جنکی وجہ سے وہ باہر کی فضا میں جا کر گم ہو جاتے ہیں۔ پہلا سبب اس کا یہ ہے کہ جتنی ان کے جذبوں کی قدر کرنی چاہیئے اتنی آپ نہیں کرتے پھر اشاعت کے ذرائع یعنی ہمارے جماعتی رسالے وغیرہ وہ ان کو قبول نہیں کرتے ساتھ ساتھ یہ کہ اگر وہ قبول کرتے بھی ہیں تو ان کے لیے ساتھ ساتھ یہ پرابلم ہو جاتا ہے کہ جب وہ ایک زمانے تک آپ کے پرچوں میں چھپتے رہیں تو دوسرے لوگ ان کو محض ایک مذہبی شاعر قرار دے دیتے ہیں۔ یعنی آپ کے پرچوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اگر اس میں کوئی چھپے تو عام غیر احمدی افراد یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض احمدی نقطۂ نظر کے شاعر ہیں اور بس وہیں تک محدود ہیں۔ تو دوسرے پرچے انہیں چھاپنے سے تعصب برتتے ہیں۔ لہٰذا یا تو "خالد" میں کوئی ایسا حصہ مخصوص کیا جائے جس میں ادبی حصے کے حوالے سے ان نوجوانوں کو جگہ دی جائے کہ جہاں اس بات کی ضرورت نہ ہو کہ مسلکاً وہ آپ کی ضرورت کا اظہار کر رہے ہیں یا نہیں۔ میں جو یہ بات عرض کر رہا ہوں اس کے پیچھے ایک بہت مستحکم دلیل ہے۔ ترقی پسند تحریک چلی تو اس زمانے کے شعراء نے اگر کہیں عورت کا ذکر کر دیا تو انہوں نے فوراً فتویٰ دیا کہ یہ ہمارے نقطۂ نظر کا آدمی نہیں ہے اور بعد میں ان لوگوں نے جو نہ مزدور سے نہ کسان سے کسی قسم کی محبت رکھتے تھے انہوں نے ایک لغت بنالی اور اس لغت کو سامنے رکھ کر انہوں نے شعر لکھنے شروع کر دیئے۔ اسی طرح کی ایک لغت آپ کے ہاں بن رہی ہے کہ ان مخصوص الفاظ کی مدد سے کر کسی نے شعر لکھے اور وہ احمدی شاعر کے نام سے آپ کے ہاں معروف ہو رہا ہے۔ انہیں چاہیئے یہ کہ وہ اس قسم کی کسی لغت کے پابند نہ ہوں کہ اس قسم کے الفاظ استعمال کر کے ہم احمدی شاعروں کی فہرست میں اپنا نام لکھا لیں گے ان کے پاس نمونے MODELS ہونے چاہیئیں اس شاعری کے جو اپنے باطن میں تو احمدی شاعری ہو اس کے ظاہری لب و لہجے میں اس کے وسیع امکانات ہوں۔ اور مختلف راستوں سے اس تک پہنچیں اگر آپ دس بارہ صفحات ایسے اپنے خالد میں رکھیں جہاں ادبی مباحث کے ساتھ، ادبی طرزِ کلام کے ساتھ ان شعراء کو جو نئے لکھنے والے ہیں آپ چھاپیں اور اسمیں یہ ضروری نہ ہو کہ وہ خالصتاً مذہبی موضوعات پر لکھ رہے ہوں بلکہ محض خالص شاعرانہ اپروچ کا اظہار کریں پھر یہ فرسٹریشن جو ہے وہ ختم ہو جائے گی۔

"حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا ایک ارشاد موجود ہے جسمیں حضور نے زور دیکر فرمایا ہے کہ ہماری جماعت کو چاہیئے کہ وہ شعر کہنے کو ترقی دیں فنِ شعر گوئی کو ترقی دیں وغیرہ"

آخر میں جناب عبید اللہ علیم صاحب نے اپنی ایک نہایت خوبصورت اور اچھوتے انداز کی نظم "وصالیہ" سنائی جو شاید اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ انگریزی ادب میں بھی اپنی طرز کی واحد نظم ہے۔ جسمیں وصال کے موضوع کو بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے باندھا گیا ہے۔ یہ نظم جناب علیم کے مجموعہ کلام "ویران سرائے کا دیا" میں شامل ہے۔

مقامِ محمودؔ

(جناب عبیداللہ علیمؔ کی ایک پرانی نظم)

مال و متاعِ جان و دل آپ پہ سب نثار ہے
میرے حضور آپ کو دینِ ہدیٰ سے پیار ہے

میرے حضور آپ سے رُوح کو زندگی ملی
میرے حضور آپ سے زندگی باوقار ہے

میرے حضور کی طرف کیسے بڑھیں نہ منزلیں
راہِ وفا میں ہر قدم آپ کا اُستوار ہے

میرے حضور آپ سے کفر کی زندگی حرام
میرے حضور ہی سے حق دہر میں آشکار ہے

میرے حضور آپ سے ٹوٹ گیا طلسمِ شب
میرے حضور صبحِ نَو آپ سے جلوہ بار ہے

میرے حضور آپ سے آج ہے عظمتِ چمن
آج بھی یہ چمن حضور، آپ سے پُربہار ہے

آپ کی مدح میں حضور کہہ نہ سکا علیمؔ کچھ
پڑھنے کے بعد اپنی نظم آپ ہی شرمسار ہے

(الفضل ۷ر جولائی ۱۹۵۹ء صفحہ ۴)

اخبارِ مجالس

آگے قدم بڑھائے جا!

شعبۂ اعتماد

مغلپورہ لاہور:۔ ۲۱ر اگست ۱۹۸۸ء کو عاملہ کی میٹنگ ہوئی۔ قائد صاحب مغلپورہ نے بعض کمیٹیاں تشکیل دیں۔

شاہدرہ ٹاؤن لاہور:۔ ۱۶ر ستمبر کو خدام کا اجلاس ہوا۔ حاضری خدام ۲۵۔ نیز اسی ماہ دو مجلس عاملہ کے اجلاس بھی ہوئے۔ ۲۱ر اکتوبر کو اجلاس عام ہوا۔ ۲۰ خدام شامل ہوئے۔ ۲ عاملہ کے اجلاس ہوئے۔

خدمتِ خلق

شاہدرہ ٹاؤن لاہور:۔

خدام نے سیلاب زدہ علاقوں میں خوراک مہیا کی، گھروں میں کپڑے تقسیم کیے۔ سیلاب زدہ گھروں کی مرمت کا سلسلہ جاری ہے۔

ضلع حیدر آباد:۔ ۵۰ بچوں اور ۱۰ بڑوں کو موسمی بخار کے انجکشن فری لگائے گئے اور گولیاں دی گئیں۔

گلبرگ لاہور:۔ سیلاب زدگان کے لیے ۳۵ خدام نے کپڑے اکٹھے کیے۔

ضلع سیالکوٹ:۔ پچاس دیہات کے بیس ہزار افراد میں اشیائے ضرورت تقسیم کی گئیں۔

ضلع شیخوپورہ:۔ سیلاب زدگان کی امداد کے لیے ۲۳۷۲ روپے نقد دیئے گئے۔ علاوہ ازیں ۱۱۲۷ روپے سے غرباء و مساکین کی امداد کی گئی۔ اس کے علاوہ کپڑے بھی مہیا کیے گئے۔

تربیت

شاہدرہ ٹاؤن لاہور:۔ خدام نے ۲۴، ۲۵ر اکتوبر کو نماز تہجد با جماعت ادا کی۔

نوکوٹ ضلع تھرپارکر:۔ ۱۶ر نومبر کو ایک تربیتی کلاس منعقد ہوئی۔

گلبرگ لاہور:- ماہ اکتوبر میں ایک نئے نماز سنٹر کا اجراء کیا گیا۔ حلقہ جات میں تربیتی دورے کئے گئے۔ ۲۸؍اکتوبر کو یوم والدین منایا گیا جلسہ کی کل حاضری ۲۰۰ تھی۔

شاہدرہ ٹاؤن لاہور:- ۱۶؍ستمبر کو نماز تہجد ادا کی گئی۔ کل افراد ۴۲ تھے۔ قیام نماز کے لئے ہر خادم سے رابطہ قائم کیا گیا۔

صحتِ جسمانی

مجلس گوندل فارم اور لطیف آباد کے درمیان فٹ بال اور کرکٹ کا میچ ہوا۔

لانڈھی کورنگی کراچی:-

۸؍جولائی ۱۹۸۸ء کو کلری جھیل میں سالانہ پکنک منائی گئی۔ دوران پکنک نماز کی ادائیگی سے غیر از جماعت بہت متاثر ہوئے۔

گلبرگ لاہور:- ۶ کرکٹ میچ کھیلے گئے۔

شاہدرہ ٹاؤن لاہور:- ۶؍ستمبر کو ایک سائیکل سفر ہوا۔ ۱۱ خدام، ایک طفل نے ۲۰ کلومیٹر کا سفر کیا۔

جلسے و اجتماعات

مغلپورہ لاہور:- ۱۵، ۱۶؍ستمبر ۱۹۸۸ء کو سالانہ اجتماع ہوا۔ اجلاس کی کل حاضری ۱۸۶ تھی۔ علمی اور ورزشی مقابلے بھی ہوئے۔

شاہدرہ ٹاؤن لاہور:- ۲۹؍اکتوبر کو سیرۃ النبیؐ کا جلسہ ہوا۔ کل ۵۴؍افراد شامل ہوئے۔ پھر سیرۃ النبیؐ کا اجلاس ۱۶؍ستمبر کو ہوا۔ حاضری ۴۶ تھی۔

سلطان پورہ لاہور:- خدام کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔ جس میں ۱۱۰ خدام، ۲۰؍انصار، ۷۰؍اطفال شامل ہوئے۔ خدام کے علمی اور ورزشی مقابلے بھی ہوئے۔ (تاریخ درج نہیں)

وقارِ عمل

شاہدرہ ٹاؤن لاہور:-

۲۸؍اکتوبر کو مثالی وقار عمل ہوا۔ ۲۰ خدام شامل ہوئے۔ ۳ گھنٹے کام ہوا۔

نوکوٹ ضلع تھرپارکر:- ۱۹؍نومبر کو مثالی وقار عمل منایا گیا۔ ۶ گھنٹے کام ہوا۔ ۱۴ خدام نے ۲۱۱۲ مربع فٹ کھدائی برائے تالاب کی۔

بدوملہی:- ۲۱؍اکتوبر کو انکے زیر اہتمام حلقہ کا ایک مثالی وقار عمل ہوا جس میں کل ۱۶۰ خدام، اطفال اور انصار شامل ہوئے۔ ۳ مقامات پر کام ہوا۔

ضلع شیخوپورہ:- ماہ ستمبر میں خدام نے ۲۸ گھنٹے وقار عمل کرکے بیت الاحمدیہ فاروق آباد اور عربی ہاؤس کے کھڑکی دروازوں پر رنگ و روغن کیا۔

مقابلہ سالانہ مقالہ نویسی

امسال شعبۂ تعلیم مرکزیہ کے تحت سالانہ مقابلہ مقالہ نویسی کا عنوان "خدام الاحمدیہ کے پچاس سال" تھا۔ کل ۷ مقالے موصول ہوئے جن کا نتیجہ مندرجہ ذیل رہا:۔

اوّل: مکرم ملک محمود احمد صاحب ناصر — دارالرحمت شرقی الف۔ ربوہ

دوم: مکرم سیّد بشارت احمد صاحب شاہ — عزیز آباد۔ کراچی

سوم: مکرم کرامت حسین صاحب مختار — اورنگی ٹاؤن۔ کراچی

اللہ تعالیٰ ان خدام کے لیئے یہ اعزاز مبارک کرے۔ آمین

(مہتمم تعلیم مرکزیہ)

دُعائے مغفرت

محترم ثاقب زیروی صاحب مدیر ہفت روزہ "لاہور" کی والدہ محترمہ عزیزہ بیگم صاحبہ ۱۱ر نومبر ۱۹۸۸ء کو میو ہسپتال میں بعمر ۹۰ سال وفات پاگئیں۔

مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۸۸ء کو بعد نماز فجر محترم مولانا دوست محمد صاحب شاہد نے نماز جنازہ پڑھائی اور تدفین کے بعد دعا کرائی۔

مرحومہ قرآن کریم کی عاشق تھیں۔ قرآن کریم پڑھنا اور پڑھانا اُن کی زندگی کا مرغوب ترین مشغلہ تھا۔

باقاعدہ نماز تہجّد ادا کرنے والی تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے۔ آمین

اعلان نکاح

میرے بیٹے عزیزم عامر رفیق قادر صاحب آف کینیڈا کا نکاح عزیزہ نیلوفر امۃ الحبیب بنت برادرم مکرم کیپٹن محمد اکبر صاحب ساہی چک ۲۵۴ ج۔ ب قادر آباد ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ساتھ مبلغ تیس ہزار روپے حق مہر پر مکرم محترم میر عبدالباسط صاحب مربی سلسلہ احمدیہ نے مورخہ ۱۱ر نومبر ۱۹۸۸ء کو بعد نماز عصر بمقام بیت الذکر چک ۲۵۴ ج۔ ب قادر آباد میں پڑھایا۔

احباب جماعت سے نکاح کے بابرکت ہونے کے لئے دعا کی درخواست ہے۔

(ڈاکٹر رفیق احمد ساہی۔ لاہور)